درس وفا

درس وفا

مولانا ابوالکلام آزاد

(پیام وطن پریس پٹودی ہاؤس دہلی)

انسانیت

انسان ہی ہے جو فرشتوں سے بہتر ہے اگر اپنی قوتوں کو امن و سلامتی کا وسیلہ بنائے اور انسان ہی ہے جو سانپ کے زہر اور بھیڑیے کے پنجے سے بھی زیادہ خونخوار ہے۔ اگر راہ امن و سلامتی کو چھوڑ کر بہیمیت اور خونخواری پر اتر آئے:

انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرا و اما کفورا (۷۶:۳)

ہم نے انسان کو راہِ عمل و ترقی دکھلا دی ہے؛ پھر یا تو ہماری ہدایت پر عمل کرنے والے ہیں یا انکار کرنے والے۔

الم نجعل لہ عینین و لسانا و شفتین وھدینٰہ

قیمت

ایک روپیہ آٹھ آنے

ناشر

عثمانیہ کتب خانہ دہلی

وہ اشرف المخلوقات کہ صورت سے آدمی ہے، خواہشوں میں بھیڑیا، محل سراؤں میں متمدن انسان مگر میدانوں میں جنگلی درندہ، اور اپنے ہاتھ پاؤں سے اشرف المخلوقات، مگر اپنی روح بہیمی میں دنیا کا سب سے زیادہ خونخوار جانور ہے۔ وہ کل تک اپنے کتابوں کے گھروں اور علم و تہذیب کے دارالعلوموں میں انسان تھا، پر آج چیتے کی کھال اس کے چمڑے کی نرمی سے زیادہ حسین اور بھیڑیے کے پنجے اس کے دندان تبسم سے زیادہ نیک ہیں۔

شیر خونخوار ہے، مگر غیروں کے لیئے۔ سانپ زہریلا ہے، مگر دوسروں کے لئے، چیتا درندہ ہے، مگر اپنے سے کمتر جانوروں کے لیئے۔ لیکن انسان دنیا کا اعلیٰ ترین مخلوق، خود اپنے ہی ہم جنسوں کا خون بہاتا اور اپنے ہی ابنائے نوع کے لیئے درندہ و خونخوار ہے!

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم، ثم رددناہ اسفل سافلین۔ الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات فلهم اجر ممنون۔ (۹۵ : ۷)

ہم نے انسان کو ایک طرف تو بہترین قوتوں کی ترکیب اور اعلیٰ ترین

النجدین ؟ (۹۰ : ۹)

پھر کیا ہم نے انسان کو دیکھنے کے لیے دو آنکھیں اور زبان اور دو ہونٹ نہیں دیئے ؟ بیشک دیئے اور خیر و شر کی دونوں راہیں اسے دکھلا دیں ۔

یہی انسانیت اعلیٰ اور ملکوتیت عظمےٰ ہے جس کی تقویم و تکمیل کے لیے دین الٰہی اور شریعت فطری کا ظہور ہوا ۔ اور یہی پیغام امن ، رہنمائے صلح و صلاح اور وسیلۂ فوز و فلاح ہے جس کا دوسرا نام "اسلام" ہے یعنی جنگ کی جگہ صلح ، خون و ہلاکت کی جگہ عمران و حیات اور بربادی و خرابی کی جگہ سلامتی و امنیت ہے ؛ وہ بتلاتا ہے کہ اگر انسان اپنی قوت ملکوتی اور فطرتِ صالح سے کام نہ لے تو وہ بڑے ہی گھاٹے میں ہے ۔

والعصر ان الانسان لفي خسر الا الذين آمنوا وعملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر (۱۰۳ ، ۳)

زمانہ اور اس کے حوادث گواہی دیتے ہیں کہ انسان بڑے ہی گھاٹے ٹوٹے میں ہے ، مگر وہ لوگ کہ اللہ پر ایمان لائے ، اعمال صالحہ اختیار کئے اور حق اور صبر کی باہمدگر وصیت کی :

درسِ وفا اگر بود زمزمۂ محبتے
جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پای را

ہجرت کی تیسری صدی قریب الاختتام ہے ـــــ بغداد کے تختِ خلافت پر المعتضد باللہ عباسی متمکن ہے ۔ معتصم کے زمانے سے دارالخلافہ کا شاہی اور فوجی مستقر سامرہ میں منتقل ہو گیا ہے ـــــ پھر بھی سرزمینِ بابل کے اِس نئے بابل میں پندرہ لاکھ انسان بستے ہیں۔ ایران کے اصطخر، مصر کے ریمس اور یورپ کے روم کی جگہ اب دنیا کا تمدنی مرکز بغداد ہے۔

دنیا کی اِس ترقی یافتہ مخلوق کا جسے "انسان" کہتے ہیں۔ کچھ عجیب حال ہے۔ یہ جتنا کم ہوتا ہے اتنا ہی نیک اور خوش ہوتا ہے اور جتنا زیادہ

جذبات کی ساخت میں پیدا کیا، لیکن پھر دوسری طرف بہیمی خواہشوں اور شریر قوتوں کے لحاظ سے نہایت ہی ادنیٰ درجہ کی مخلوق تک بھی لوٹا لایا۔ ہاں وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے اور اعمال صالحہ و عادلہ اختیار کیے؛ سو ان کے لیے بے انتہا اجر ہے۔ کیونکہ وہ ان متضاد قوتوں کی کشاکش سے بچ نکلیں گے۔

اب انسانوں کی بستیاں اور اولادِ آدم کی آبادیاں راحت کی سانس اور امن کے تنفس سے خالی ہوگئی ہیں۔ کیونکہ وہ جو خدا کی زمین پر سب سے اچھا اور سب سے بڑھ کر تھا اگر سب سے بُرا اور سب سے کمتر ہو جائے تو جس طرح اس سے زیادہ کوئی نیک نہ تھا ویسا ہی اس سے بڑھ کر اور کوئی بُرا بھی نہیں ہو سکتا۔

انسانیت کی بستی اُجاڑ ہوگئی، نیکی کا گھر لوٹ لیا گیا، اور دُنیا بمثل اس بیوہ کے ہوگئی جس کا شوہر زبردستی قتل کر دیا گیا اور اس کے یتیم بچوں پر رحم نہ کیا گیا ہو۔ اب وہ اپنے لٹے ہوئے سنگھار پر ماتم کرے گی اور اپنی پھٹی ہوئی چادر کو سر سے اُتار دے گی۔ کیوں کہ اس کا حسن زخمی ہوگیا، کیونکہ اس کا شباب پامال کر دیا گیا۔ (ابُو الکلام آزاد)

خود غرضی کا منحصر ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے عالیشان مکانوں میں عیش و نعمت کے دستر خوانوں پر بیٹھتا ہے تو اس کے کتنے ہی ہم جنس سڑکوں پر ایڑیاں رگڑتے ہیں۔ جب وہ عیش و راحت کے ایوانوں میں حسن و جمال کی محفلیں آراستہ کرتا ہے تو اُس کے ہمسایہ میں یتیموں کے آنسو نہیں تھمتے اور کتنی ہی بیوائیں ہیں جن کے بدنصیب سروں پہ چادر کا ایک تار بھی نہیں ہوتا۔ زندگی کی قدرتی یکسانی کی جگہ اب زندگی کی مصنوعی مگر بے رحم تفاوتیں ہر گوشے میں نمایاں ہو جاتی ہیں۔

پھر جب انسانی بے مہری اور خود غرضی کے لازمی نتائج ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ کمزوری افلاس اور بے نوائی سے مجبور ہو کر بد بخت انسان جرم کی طرف قدم اٹھاتا ہے تو اچانک دنیا کی زبانوں کا سب سے زیادہ بے معنی لفظ وجود میں آتا ہے یہ "قانون" اور "انصاف" ہے۔ اب بڑی شاندار عمارتیں تعمیر کی جاتی ہیں اور اُن کے دروازہ پہ لکھا جاتا ہے "انصاف کا گھر" انصاف کے اِس "مقدس گھر" میں کیا ہوتا ہے: یہ ہوتا ہے کہ وہی انسان جس نے اپنی بے رحمی و تغافل سے مفلس کو چوری اور نیک انسانوں کو بد اطوار بن جانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ قانون

بڑھتا ہے، اتنی ہی نیکی اور خوشی اس سے دُور ہونے لگتی ہے۔ یہ جب چھوٹی چھوٹی بستیوں میں گھانس پھونس کے چھپر ڈال کر رہتا ہے۔ تو کیسا نیک، کیسا خوش اور کس درجہ حلیم ہوتا ہے؟ محبت اور رحمت اُس میں اپنا آشیانہ بناتی ہے اور رُوح کی پاکیزگی کا نور اُس کے جھونپڑوں کو روشن کرتا ہے۔ لیکن جونہی یہ جھونپڑیوں سے باہر نکلتا ہے اُس کی بڑی بڑی بھیڑیں ایک خاص رقبہ میں اکٹھی ہو جاتی ہیں تو اُس کی حالت میں کیسا عجیب انقلاب ہو جاتا ہے؟ ایک طرف تجارت بازاروں میں آتی ہے۔ صنعت و حرفت کارخانے کھولتی ہے۔ دولت سربفلک عمارتیں بناتی ہے۔ حکومت و امارت شان و شکوہ کے سامان آراستہ کرتی ہے۔ لیکن دوسری طرف نیکی رخصت ہو جاتی ہے۔ محبت اور فیاضی کا سراغ نہیں ملتا اور امن و راحت کی انسانی مصیبتوں اور شقاوتوں کا ایک لازوال دَور شروع ہو جاتا ہے۔ وہی انسان کی بستی جو پہلے نیکی اور محبت کی دنیا اور راحت و برکت کی بہشت تھی اب افلاس و مصیبت کا مقتل اور جرموں کا دوزخ بن جاتی ہے۔ وہی انسان جو جھونپڑوں کے اندر محبت و فیاضی کی گرمجوشی تھا اب شہر کے سربفلک محلوں کے اندر بے مہری

و

یہ ہے انسان کی شہری اور متمدّن زندگی کا اخلاق! وہ خود ہی انسان کو برائی پر مجبور کرتا ہے اور خود ہی سزا بھی دیتا ہے۔ پھر ظلم اور بے رحمی کے اس تسلسل کو "انصاف" کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اُس "انصاف" کے نام سے، جو دُنیا کی سب سے زیادہ مشہور مگر سب سے زیادہ غیر موجود حقیقت ہے۔

چوتھی صدی ہجری کا بغداد دنیا کا سب سے بڑا شہر اور انسانی تمدن کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ انسانی آبادی و تمدن کے یہ تمام لازمی نتائج موجود ہوتے۔ گندگی میں مکھیاں اور دلدل میں مچھر اس تیزی سے پیدا نہیں ہوتے جس تیزی سے شہروں کی آب و ہوا جرم اور مجرموں کو پیدا کرتی ہے۔ بغداد کے قید خانے مجرموں سے بھرے ہوتے تھے پھر بھی اس کی آبادیوں میں مجرموں کی کوئی کمی نہ تھی۔

بغداد میں آج کل جس طرح حضرت شیخ جنید بغدادی علیہ الرحمۃ کی بزرگی و دُرویشی کی شہرت ہے اُسی طرح ابن ساباط کی چوری اور عیاری بھی مشہور ہے۔ پہلی شہرت نیکی کی ہے۔ دوسری بدی کی — دنیا میں بدی

کی پرہیبت جبّہ پہن کر آتا ہے اور فرشتوں کا سا معصوم اور راہبوں کا سا سنجیدہ چہرہ بنا کر حکم دیتا ہے کہ مجرم کو سزا دی جائے۔

کیوں ـــــ ؟

اِس لیے کہ اُس نے چوری کی ہے۔

اُس بدبخت نے چوری کیوں کی ـــــ ؟

اِس لیے کہ وہ انسان ہے اور انسان بھوک کا عذاب برداشت نہیں کرسکتا۔ اِس لیے کہ وہ شوہر ہے اور شوہر اپنی بیوی کو بھوک سے ایڑیاں رگڑتے دیکھ نہیں سکتا۔ اِس لیے کہ وہ باپ ہے اور باپ کی طاقت سے باہر ہے کہ اپنے بچوں کے اُن آنسوؤں کا نظارہ کرسکے جو بھوک کی اذیّت سے اُن کے معصوم چہروں پر بہ رہے ہوں۔

پھر اگر بدقسمت انسان قیدخانہ اور تازیانے کی سزائیں جھیل کر بھی اِس قابل نہیں ہو جاتا کہ بغیر غذا کے زندہ رہ سکے تو "مقدس انصاف" اصلاح اور انسانیت کا آخری قدم اُٹھاتا ہے اور کہتا ہے اسے سولی کے تختے پر لٹکا دو! یہ گویا انسان کے پاس اس کے ابناء جنس کی مصیبتوں کا آخری علاج ہے۔

پڑے اور مر گئے۔ قافلہ والوں کو رحم آیا اور اپنے ساتھ بغداد پہنچا دیا۔ یہ اب سے دو برس پیشتر کی بات ہے۔ یہ دو برس اس نے کہاں اور کیونکر بسر کیے؟ اس کا حال کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ گرفتاری کے وقت اُس کی عمر پندرہ سولہ برس کی تھی۔ کوتوالی کے چبوترے پر لٹا کر تازیانے مارے گئے اور چھوڑ دیا گیا۔

اس پہلی سزا نے اس کی طبیعت پر کچھ عجیب طرح کا اثر ڈالا۔ وہ اب تک ایک ڈرا سہما کم سن لڑکا تھا۔ اب اچانک ایک دلیر اور بے باک مجرم کی رُوح اُس کے اندر پیدا ہو گئی۔ گویا اُس کی تمام شقاوتیں اپنے ظہور کے لیے تازیانے کی ضرب کی منتظر تھیں۔ مجرمانہ اعمال کے تمام بھید اور بدیوں، گناہوں کے تمام مخفی طریقے جو کبھی اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں گزرے تھے، اب اس طرح اُس پر کھُل گئے گویا ایک تجربہ کار اور مشاق مجرم کا دماغ اُس کے سر میں اتار دیا گیا۔ تھوڑے ہی دنوں کے اندر وہ ایک پکا عیار اور ایک چھٹا ہوا جرائم پیشہ انسان تھا۔

اب وہ چھوٹی چھوٹی چوریاں نہیں کرتا تھا۔ پہلی مرتبہ جب اُس نے چوری کی تھی تو دو دن کی بھوک اُسے نان بائی کی دکان پر لے گئی تھی۔ لیکن اب وہ

نیکی کی ہر چیز کی طرح، اُس کی شہرت کا بھی مقابلہ کرنا چاہتی ہے اگر نہیں کر سکتی۔

دس برس سے ابنِ ساباط مدائن کے محبس میں قید ہے۔ اُس کے خوف ناک حملوں سے لوگ محفوظ ہو گئے ہیں۔ تاہم اس کی عیاریوں اور بے باکیوں کے افسانے لوگ بھولے نہیں۔ وہ جب کبھی کسی دلیرانہ چوری کا حال سُنتے ہیں تو کہنے لگتے ہیں:

"یہ دوسرا ابنِ ساباط ہے۔"

اِس دس برس کے اندر کتنے ہی نئے ابنِ ساباط پیدا ہو گئے مگر پرانے ابنِ ساباط کی شہرت کا کوئی مقابلہ نہ کر سکا۔ بغداد والوں کی بول چال میں وہ "جرائم کا شیطان اور برائیوں کا عفریت" تھا۔

ابنِ ساباط کے خاندانی حالات عوام کو بہت کم معلوم ہیں۔ جب وہ پہلی مرتبہ سُوق النخّاسین میں چوری کرتا ہوا گرفتار ہوا تو کوتوالی میں اس کے حالات کی تفتیش کی گئی۔ معلوم ہوا یہ بغداد کا باشندہ نہیں ہے۔ اس کے ماں باپ طوس سے ایک قافلہ کے ساتھ آ رہے تھے۔ راہ میں بیمار

میں اس کا "پہنچا" الگ کر دیا۔

ابن ساباط کے ہاتھ کا کٹنا، کٹنا نہ تھا بلکہ سیکڑوں نئے ہاتھوں کو اس کے شانے سے جوڑ دینا تھا۔ معلوم ہوتا ہے دنیا کے سارے شیطان اور عفریت اس واقعہ کے انتظار میں تھے۔ جوں ہی اس کا ہاتھ کٹا۔ انھوں نے اپنے سیکڑوں ہاتھ اس کے حوالے کر دیئے۔ اب اس نے عراق کے تمام چور اور عیّار جمع کر کے اپنا اچھا خاصہ جتھا بنا لیا اور ساز و سامان کے ساتھ لوٹ مار شروع کر دی۔ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر اس کے دلیرانہ حملوں نے تمام عراق میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ قافلوں پہ حملے کرتا، دیہاتوں میں ڈاکے ڈالتا، محل سراؤں میں نقب لگاتا، سرکاری خزانے لوٹ لیتا۔ اور پھر یہ سب کچھ اس ہوشیاری اور فرزانگی کے ساتھ کرتا کہ اس پہ یا اس کے ساتھیوں پہ کوئی آنچ نہ آتی۔ ہر موقع پہ صاف بچ کر نکل جاتا۔ لوگ جب اس کے مجرمانہ کارنامے سنتے تو دہشت و حیرت سے مبہوت رہ جاتے۔

"یہ ڈاکو نہیں ہے جرم کی ایک خبیث روح ہے۔ وہ انسان کو لوٹ لیتی ہے مگر انسان اسے چھو نہیں سکتا!"

——— یہ بغداد والوں کا متفقہ فیصلہ تھا۔!

بھوک سے بے بس ہو کر نہیں بلکہ جرم کے ذوق سے وارفتہ ہو کر چوری کرتا تھا۔ اِس لیے اُس کی نگاہیں نان بائی کی روٹیوں پر نہیں بلکہ صرافوں کی تھیلیوں اور سوداگروں کے ذخیروں پر پڑتی تھیں۔ دِن ہو یا رات، بازار کی منڈی ہو یا امیر کا دیوان خانہ، ہر وقت اور ہر جگہ اس کی کارستانیاں جاری رہتیں۔ اُس کے اندر ایک فاتح کا جوش تھا، سپہ سالار کا عزم تھا۔ سپاہی کی مردانگی تھی، مدبّر کی سی دانشمندی تھی۔ لیکن دنیا نے اُس کے لیے یہی پسند کیا کہ وہ بغداد کے بازاروں کا چور ہو۔ اِس لیے اُس کی فطرت کے تمام جوہر اِسی راہ میں نمایاں ہونے لگے۔

افسوس ـــ! فطرت کس فیاضی سے بخشتی ہے، مگر انسان کس بیدردی سے برباد کرتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد جب ابنِ ساباط کی دراز دستیاں حد سے بڑھ گئیں تو حکومت کو خصوصیت کے ساتھ توجہ ہوئی۔ آخر ایک دن گرفتار کر لیا گیا۔ اَب یہ ایک کم سِن لڑکا نہ تھا شہر کا سب سے بڑا چور تھا۔ عدالت نے فیصلہ کیا کہ ایک ہاتھ کاٹ ڈالا جائے۔ فوراً تعمیل ہوئی اور جلاد نے ایک ہی ضرب

ابنِ ساباط نے اپنے اِس طرزِ عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ جرم سے بھی بڑھ کر بُرائی کا ایک درجہ رکھتا ہے۔

بہر حال اب ابنِ ساباط مدائن کے قید خانہ میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ اُس کی آخری گرفتاری پر دس برس گزر چکے ہیں۔ دس برس کا زمانہ اِس کے لیے کم مدّت نہیں ہے کہ ایک مجرم کی سیاہ کاریاں بھُلا دی جائیں۔ لیکن ابنِ ساباط جیسے مجرم کے کارنامے مدّتوں تک نہیں بھُلائے جا سکتے۔ دس برس گزرنے پر بھی اُس کے دلیرانہ جرائم کا ذکر بچّہ بچّہ کی زبان پر ہے۔ لوگوں کو یہ بات تو کبھی بھُولے سے بھی یاد نہیں آتی کہ ابنِ ساباط ہے کہاں اور کس حالت میں؟ کیونکہ یہ معلوم کرنے کی اُنھیں ضرورت بھی نہیں ہے۔ البتہ وہ اُس کے دلیرانہ کارنامے بھُولنا نہیں چاہتے، کیونکہ اِس تذکرہ میں اُن کے لیئے لطف اور دلچسپی ہے۔ اُنھیں ابنِ ساباط کی نہیں اپنی دلچسپیوں کی فکر ہے!

انسان کی بے مہریوں کی طرح اُس کی دلچسپیوں کا بھی کیسا عجیب حال

مگر ظاہر ہے، یہ حالت کب تک جاری رہ سکتی تھی؟ آخر وہ وقت آ گیا کہ ابن ساباط تیسری مرتبہ قانون کے پنجے میں گرفتار ہو جائے۔ ایک موقع پر جب اُس نے اپنے تمام ساتھیوں کو بحفاظت نکال دیا تھا اور خود نکل بھاگنے کی تیاری کر رہا تھا، حکومت کے سپاہی پہنچ گئے اور گرفتار کر لیا۔

اِس مرتبہ وہ ایک رہزن اور ڈاکو کی حیثیت میں گرفتار ہوا تھا، اس کی سزا قتل تھی۔ ابن ساباط نے جب دیکھا کہ جلّاد کی تلوار سر پہ چمک رہی ہے تو اس کے مجرمانہ خصائل نے اچانک ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیا۔ وہ تیار ہو گیا کہ اپنے بچاؤ کے لیے اپنے ساتھیوں کی جانیں قربان کر دے۔ اُس نے عدالت سے کہا۔ اگر اُسے قتل کی سزا نہ دی جائے تو وہ اپنے جتھے کے تمام چور گرفتار کرا دے گا۔ عدالت نے منظور کر لیا۔ اِس طرح ابن ساباط خود تو قتل سے بچ گیا لیکن اُس کے سَو سے زیادہ ساتھی اُس کی نشان دہی پر موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے! ان سَو چوروں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس نے قتل ہونے سے پہلے ابن ساباط پر لعنت نہ بھیجی ہو۔ بدعہدی اور بے وفائی ایسی برائی ہے جسے بُرے بھی سب سے بڑی بُرائی سمجھتے ہیں۔

جوشِ نظارہ میں مجنوں ہو کر ایک دوسرے پر گرنے لگتے ہیں۔ لیکن انسانی دلچسپی کے اِس جہنمی منظر میں اُس مکان اور اُس کے مکینوں کے لیے کیسی ہلاکت اور تباہی ہے؟ اور جان و مال کی کیسی المناک بربادیوں کے بعد آگ اور موت، کی یہ ہولناک دلچسپی وجود میں آسکی ہے؟ اِس بات کے سوچنے کی نہ تو لوگوں کو فرصت ملتی ہے، نہ وہ سوچنا چاہتے ہیں۔!

اگر انسان کے ابنا، جنس میں سے ایک بدبخت مخلوق سُولی کے تختہ پر لٹکا دیا جائے تو یہ اُن تمام نظاروں میں سے جن کے دیکھنے کا انسان شائق ہوسکتا ہے، سب سے زیادہ دل کش نظارہ ہوتا ہے۔ اتنا دل کش نظارہ کہ گھنٹوں کھڑے رہ کر لٹکتی ہوئی نعش دیکھتا رہتا ہے مگر اُس کی سیری نہیں ہوتی۔ لوگ درختوں پر چڑھ جاتے ہیں ایک دوسرے پر گرنے لگتے ہیں؛ صفیں چیر چیر کر نکل جانا چاہتے ہیں۔

کیوں ——؟

اِس لیے کہ اپنے ہم جنس کو جانکنی میں تڑپتے اور پھر ہوا میں معلّق جھولتے دیکھ لینے کی لذّت حاصل کرلیں! لیکن جس انسان کے پھانسی پانے سے انسانی نظارہ کا یہ سب سے زیادہ دلکش تماشا وجود میں آیا خود اُس

ہے۔ وہ عجیب عجیب اور غیر معمولی باتیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ لیکن اِس کی پرواہ نہیں کرتا کہ اِس کی دلچسپی کا یہ تماشا کیسی کیسی مصیبتوں اور شقاوتوں کی پیدائش کے بعد ظہور میں آسکا؟ اگر ایک چور دلیری کے ساتھ چوری کرتا ہے تو یہ اُس کے لیے بڑی ہی دلچسپی کا واقعہ ہے۔ وہ اُس کی صورت دیکھنے کے لیے بے قرار ہو جاتا ہے۔ وہ گھنٹوں اِس پر رائے زنی کرتا ہے اور وہ تمام اخبار خرید لیتا ہے جن میں اُس کی تصویر چھپی ہو یا اُس کا تذکرہ کیا گیا ہو۔ لیکن اس واقعہ میں چور کے لیے کیسی شقاوت ہے اور جس مسکین کا مال چوری ہو گیا ہے اُس کے لیے کیسی مصیبت ہے؟ اس کے سوچنے کی وہ کبھی زحمت گوارا نہیں کرتا!

اگر ایک مکان میں آگ لگ جائے تو انسان کے لیئے یہ بڑا ہی دلچسپ نظارہ ہوتا ہے۔ سارا شہر امنڈ آتا ہے۔ جس کسی کو دیکھو بے تحاشا دوڑا جاتا ہے۔ لوگ اِس نظارہ کے شوق میں اپنا کھانا پینا تک بھول جاتے ہیں۔ اگر چند زندہ انسانوں کے جھلسے ہوئے چہرے آگ کے شعلوں کے اندر نمودار ہو جائیں اور اُن کی چیخیں اتنی بلند ہوں کہ دیکھنے والوں کے کانوں تک پہنچ سکیں، تو پھر اِس نظارہ کی دلچسپی انتہائی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ تماشائی

L813

طرح ختم ہو جائے گی؟"

یہ خوفناک ابنِ سآباط ہے جو دس برس کی طول طویل زندگی قید خانہ میں بسر کر کے اب کسی طرح نکل بھاگا ہے اور نکلنے کے ساتھ ہی اپنا قدیم پیشہ از سرِ نو شروع کر رہا ہے۔ یہ اس کی نئی مجرمانہ زندگی کی پہلی رات ہے۔ اِس لیے وقت کے بے نتیجہ ضائع جانے پر اُس کا بے صبر دل پیچ و تاب کھا رہا ہے۔

اُس نے ہر طرف کی آہٹ لی۔ زمین سے کان لگا کر دُور دُور کی صداؤں کا جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر آگے بڑھا۔ کچھ دُور چل کر اِس نے دیکھا کہ ایک احاطہ کی دیوار دُور تک چلی گئی ہے اور وسط میں بہت بڑا پھاٹک ہے کرخ کے اِس علاقہ میں زیادہ تر امراء کے باغ تھے یا سوداگروں کے گودام تھے۔ اس نے خیال کیا۔ یہ احاطہ یا تو کسی امیر کا باغ ہے یا کسی سوداگر کا گودام۔ وہ پھاٹک کے پاس پہنچ کر رُک گیا اور سوچنے لگا، اندر کیونکر جائے؟ اُس نے آہستگی سے دروازہ پر ہاتھ رکھا لیکن اُسے نہایت تعجب ہوا کہ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا، صرف بھڑا ہوا تھا۔ ایک سیکنڈ کے اندر ابنِ سآباط کے قدم احاطہ کے اندر پہنچ گئے۔

اُس نے دہلیز سے قدم آگے بڑھایا تو ایک وسیع احاطہ نظر آیا۔ اِس

پر کیا گزری اور کیوں وہ اِس منحوس اور شرمناک موت کا مستحق ٹھہرا؟ سیکڑوں ہزاروں تماشائیوں میں سے ایک کا ذہن بھی اس غیر ضروری اور غیر دلچسپ پہلو کی طرف نہیں جاتا!

گرمیوں کا موسم ہے، آدھی رات گزر چکی ہے، مہینہ کی آخری راتیں ہیں، بغداد کے آسمان پر ستاروں کی مجلسِ شبینہ آراستہ ہے مگر چاند کے برآمد ہونے میں ابھی دیر ہے۔ دجلہ کے پار کرخ کی تمام آبادی نیند کی خاموشی اور رات کی تاریکی میں گم ہے۔

اچانک تاریکی میں ایک متحرک تاریکی نمایاں ہوئی —— سیاہ لبادے میں ایک لپٹا ہوا آدمی خاموشی اور آہستگی کے ساتھ جا رہا ہے۔ وہ ایک گلی سے مڑ کر دوسری گلی میں پہنچا اور ایک مکان کے سائبان کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اب اُس نے سانس لی۔ گویا یہ مدت کی بند سانس تھی جسے اب آزادی سے اُبھرنے کی مہلت ملی ہے۔ پھر اُس نے آسمان کی طرف نظر اُٹھائی۔ "یقیناً تین پہر رات گزر چکی ہے" وہ اپنے دل میں کہنے لگا۔

"مگر کیا بدنصیبی ہے کہ جس طرف رُخ کیا ناکامی ہی ہوئی۔ کیا پوری رات اسی

دس برس کی قید کے بعد آج ابن ساباط کو پہلی مرتبہ موقعہ ملا تھا کہ اپنے دل پسند کام کی جستجو میں آزادی کے ساتھ نکلے۔ جب اِس نے دیکھا، اِس مکان میں کامیابی کے آثار نظر نہیں آتے اور یہ پہلا قدم بیکار ثابت ہوگا تو اُس کے تیز اور بے لگام جذبات سخت مشتعل ہو گئے۔ وہ دِل ہی دل میں اِس مکان کے رہنے والوں کو گالیاں دینے لگا جو اپنے مکان میں رکھنے کے لیئے قیمتی اشیاء فراہم نہ کر سکے ——— ایک مفلس کا افلاس خود اُس کے لیے اِس قدر درد انگیز نہیں ہوتا جس قدر اُس چور کے لیے جو رات کے پچھلے پہر مال و دولت تلاش کرتا ہوا پہنچتا ہے۔ اس میں شک نہیں، پشمینہ کے بہت سے تھان یہاں موجود تھے اور وہ کتنے ہی موٹے اور ادنیٰ قسم کے کیوں نہ ہوں مگر پھر بھی اپنی قیمت رکھتے تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ابنِ ساباط تنہا تھا اور صرف تنہا ہی نہیں تھا بلکہ دو ہاتھوں کی جگہ صرف ایک ہاتھ رکھتا تھا۔ وہ ہزار ہمت کرتا مگر اتنا بڑا بوجھ اِس کے سنبھالے سنبھل نہیں سکتا تھا۔ وہ تھانوں کی موجودگی پہ معترض نہ تھا۔ اُن کے وزن کی گرانی اور اپنی مجبوری پر متاسف تھا۔ اتنی وزنی چیز چرا کے لے جانا آسان نہ تھا۔

”ایک ہزار لعنت کرخ اور اُس کے تمام باشندوں پر“ وہ اندر ہی اندر

کے مختلف گوشوں میں چھوٹے چھوٹے حجرے بنے ہوئے تھے اور وسط میں ایک نسبتاً بڑی عمارت تھی۔ یہ درمیانی عمارت کی طرف بڑھا۔ عجیب بات ہے کہ اس کا دروازہ بھی اندر سے بند نہ تھا۔ چھُوتے ہی کھُل گیا۔ گویا وہ کسی کی آمد کا منتظر تھا۔ یہ ایک ایسی بے باکی کے ساتھ جو صرف مشّاق مجرموں ہی کے قدموں میں ہوسکتی ہے اندر چلا گیا۔ اندر جا کر دیکھا تو ایک وسیع ایوان (ہال) تھا۔ لیکن سامانِ راحت و زینت میں سے کوئی چیز بھی نہ تھی۔ قیمتی اشیاء کا نام و نشان نہ تھا۔ صرف ایک کھجور کے پتوں کی پُرانی چٹائی بچھی تھی اور ایک طرف چمڑے کا ایک تکیہ پڑا تھا۔ البتہ ایک گوشہ میں پشمینے کے موٹے کپڑے کے بہت سے تھان اِس طرح بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ گویا کسی نے جلدی میں پھینک دیئے ہیں اور اُن کے قریب ہی بھیڑ کی کھال کی چند ٹوپیاں پڑی تھیں۔ اُس نے مکان کی موجودات کا یہ پورا جائزہ کچھ تو اپنی اندھیرے میں دیکھ لینے والی آنکھوں سے لے لیا تھا اور کچھ اپنے ہاتھ سے ٹٹول ٹٹول کر۔ لیکن اُس کا ہاتھ ایک ہی تھا۔ یہ بغداد والوں کی بول چال میں "ایک ہاتھ کا شیطان" تھا۔ جو اب پھر قید و بند کی زنجیریں توڑ کر آزاد ہو گیا ہے!

گٹھڑی باندھنے کے لیئے سودمند نہ تھے۔ اُس نے بہت سی تجویزیں سوچیں، طرح طرح کے تجربے کیے۔ دانتوں سے کام لیا۔ کٹی ہوئی کہنی سے سیرا دبایا۔ لیکن کسی طرح بھی گٹھڑی میں گرہ نہ لگ سکی۔ وقت کی مسیبتوں میں تاریکی کی شدّت نے اور زیادہ اضافہ کر دیا تھا۔

اندرونی جذبات کے ہیجان اور بیرونی فعل کی بے سود محنت نے ابنِ ساباط کو بہت جلد تھکا دیا۔ وقت کی کمی، عمل کا قدرتی خوف، مال کی گرانی، محنت کی شدت اور فائدہ کی قلّت، اُس کے دماغ کے لیے تمام مخالف تأثرات جمع ہو گئے تھے۔

اچانک وہ چونک اٹھا۔ اُس کی تیز قوتِ سماعت نے کسی کے قدموں کی نرم آہٹ محسوس کی۔ ایک لمحہ تک خاموشی رہی۔ پھر ایسا محسوس ہُوا۔ جیسے کوئی آدمی دروازہ کے پاس کھڑا ہے۔ ابنِ ساباط گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مگر قبل اِس کے کہ وہ کوئی حرکت کر سکے، دروازہ کھُلا اور روشنی نمایاں ہوئی۔ خوف اور دہشت سے اُس کا خون منجمد ہو گیا۔ جہاں کھڑا تھا وہیں قدم گڑ گئے۔ نظر اُٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک شخص کھڑا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں شمعدان ہے

بڑبڑانے لگا: "نہیں معلوم یہ کون احمق ہے جس نے یہ ملعون تھان جمع کر رکھے ہیں؟ غالباً کوئی تاجر ہے۔ لیکن یہ عجیب طرح کا تاجر ہے جسے بغداد میں تجارت کرنے کے لیے اور کوئی چیز نہیں ملی۔ اتنا بڑا مکان بنا کر اس میں گدھوں اور خچروں کی جھول بنانے کا سامان جمع کر دیا۔" اس نے اپنے ایک ہی ہاتھ سے ایک تھان کی ٹٹول ٹٹول کر پیمائش کی۔ "بھلا یہ ملعون بوجھ کس طرح اٹھایا جا سکتا ہے؟ ایک تھان کے اٹھانے کے لیے گن کر دس گدھے ساتھ لانے چاہئیں۔

لیکن بہرحال کچھ نہ کچھ کرنا ضروری تھا۔ رات جا رہی تھی، اور اب وقت نہ تھا کہ دوسری جگہ تاکی جاتی۔ اس نے جلدی سے ایک تھان کھولا اور اسے فرش پر بچھا دیا۔ پھر کوشش کی، زیادہ سے زیادہ تھان جو اٹھائے جا سکتے ہیں اٹھا لے۔ مشکل یہ تھی کہ مال کم قیمت مگر بہت زیادہ وزنی تھا۔ کم لیتا ہے تو بیکار ہے۔ زیادہ لیتا ہے تو لیجا نہیں سکتا۔ عجب طرح کی کشمکش میں گرفتار تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ طے ہوا۔ لیکن اب دوسری مشکل پیش آئی۔ صوف کا کپڑا بے حد موٹا تھا، اسے مروڑ دے کر گرہ لگانا آسان نہ تھا۔ دونوں ہاتھوں سے بھی یہ کام مشکل تھا چہ جائے کہ ایک ہاتھ سے؟ بلاشبہ اس کے پاس ہاتھ کی طرح پاؤں ایک نہ تھا دو تھے۔ لیکن وہ بھاگنے میں مدد دے سکتے تھے۔ صوف کی

میں کوئی ایسی شاندار چیز تھی کہ دیکھنے والا محسوس کرتا تھا، ایک نہایت طاقت ور چہرہ اُس کے سامنے ہے۔ خصوصاً اُس کی نگاہیں ایسی روشن، ایسی مطمئن، ایسی ساکن تھیں کہ معلوم ہوتا تھا دنیا کی ساری راحت اور سکون انہی دو حلقوں کے اندر سما گئی ہے۔

چند لمحوں تک یہ شخص شمع اونچی کیے ابنِ ساباط کو دیکھتا رہا۔ پھر اِس طرح آگے بڑھا۔ گویا اُسے جو کچھ سمجھنا تھا، سمجھ چکا ہے۔ اُس کے چہرہ پر ہلکا سا زیرِ لب تبسم تھا۔ ایسا دلآویز اور شیریں تبسم جس کی موجودگی انسانی روح کے سارے اضطراب اور خوف دُور کر سکتی ہے۔ اُس نے شمعدان ایک طرف رکھ دیا، اور ایک ایسی آواز میں جو شفقت و ہمدردی میں ڈوبی ہوئی تھی، ابنِ ساباط سے کہا:۔

“میرے دوست! تم پر خدا کی سلامتی ہو۔ جو کام تم کرنا چاہتے ہو، یہ بغیر روشنی اور ایک رفیق کے انجام نہیں پا سکتا۔ دیکھو، یہ شمع روشن ہے اور مَیں تمھاری رفاقت کے لئے موجود ہوں۔ روشنی میں ہم دونوں اطمینان اور سہولت کے ساتھ یہ کام انجام دے لیں گے۔”

وہ ایک لمحہ کے لیئے رکا۔ جیسے کچھ سوچنے لگا ہے۔ پھر اُس نے کہا:۔

مگر میں دیکھتا ہوں تم بہت تھک گئے ہو۔ تمھاری پیشانی پسینہ سے تر ہو رہی

اور اُسے اِس طرح اونچا کر رکھا ہے کہ کمرے کے تمام حصّے روشن ہو گئے ہیں۔

اِس شخص کی وضع قطع سے اُس کی شخصیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا ——— ملگجے رنگ کی ایک لمبی عبا اُس کے جسم پر تھی جسے کمر کے پاس ایک موٹی رسّی لپیٹ کر جسم پر چُست کر لیا تھا۔ سر پر سیاہ قلنسوہ (اونچی دیوار کی ٹوپی) تھی۔ اور اِس قدر کشادہ تھی کہ اِس کے کنارے ابروؤں کے قریب تک پہنچ گئے تھے۔ جسم نہایت نحیف تھا۔ اتنا نحیف کہ صوف کی موٹی عبا پہننے پر بھی اندر کی اُبھری ہوئی ہڈیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں اور قد کی درازی نے جس میں کمر کے پاس خفیف سی خمیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ نحافت اور زیادہ نمایاں کر دی تھی۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ جسم کی اِس غیر معمولی نحافت کا کوئی اثر اُس کے چہرہ پر نظر نہیں آتا تھا۔ اتنا کمزور جسم رکھنے پر بھی اُس کا چہرہ کچھ عجیب طرح کی تاثیر و گیرائی رکھتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ہڈیوں کے ایک ڈھانچے پر ایک شاندار اور دلآویز چہرہ جوڑ دیا گیا ہے۔ رنگت زرد تھی، رخسار بے گوشت تھے جسمانی تنومندی کا نام و نشان نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی چہرہ کی مجموعی ہیئت

پہلے وہ گٹھڑی کھولی جو ابنِ سا باط نے باندھنی چاہی تھی مگر نہیں بند سکی تھی۔ پھر دو تھان کھول کر بچھا دیئے اور جس قدر بھی تھان موجود تھے اُن سب کو دو حصّوں میں منقسم کر دیا۔ ایک حصّہ میں زیادہ تھے ایک میں کم۔ پھر دونوں کی الگ الگ دو گٹھڑیاں باندھ لیں۔ یہ تمام کام اُس نے اِس اطمینان اور سکون کے ساتھ کیا گویا اِس میں اُس کے لیے کوئی انوکھی بات نہ تھی۔

پھر اچانک اُسے کچھ خیال آیا۔ اُس نے اپنی عبا اُتار ڈالی اور اسے بھی گٹھڑی کے اندر رکھ دیا۔

اب وہ اٹھا اور ابنِ سا باط کے قریب گیا۔

"میرے دوست! تمھارے چہرے کی پژمردگی سے معلوم ہوتا ہے کہ تم صرف تھکے ہوئے ہی نہیں ہو بلکہ بھوکے بھی ہو۔ بہتر ہو گا کہ چلنے سے پہلے دودھ کا ایک پیالہ پی لو۔ اگر تم چند لمحے انتظار کر سکو تو میں دودھ لے آؤں۔" اُس نے کہا، جبکہ اُس کے پرشکوہ چہرہ پہ بدستور مسکراہٹ کی دلآویزی موجود تھی ممکن نہ تھا کہ اِس مسکراہٹ سے انسانی قلب کے تمام اضطراب محو نہ ہو جائیں!

قبل اس کے کہ ابنِ سا باط جواب دے وہ تیزی کے ساتھ لوٹا اور باہر نکل گیا۔

ہے۔ یہ گرم موسم، بند کمرہ، تاریکی اور تاریکی میں ایسی سخت محنت، افسوس، انسان کو اپنے رزق کے لیے کیسی کیسی زحمتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں! دیکھو، یہ چٹائی بچھی ہے۔ یہ چمڑے کا تکیہ ہے۔ میں اسے دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہوں" اُس نے تکیہ دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیا۔ "بس ٹھیک ہے۔ اب تم اطمینان کے ساتھ ٹیک لگا کر یہاں بیٹھ جاؤ اور اچھی طرح سستا لو۔ اتنی دیر میں میں تمھارا ادھورا کام پورا کیے دیتا ہوں"۔

اُس نے یہ کہا اور ابنِ ساباط کے کاندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کر اُسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ پھر جب اُس کی نظر دوبارہ اُس کی عرق آلود پیشانی پر پڑی تو اُس نے اپنی کمر سے رومال کھولا اور اس کی پیشانی کا پسینہ پونچھ ڈالا۔ جب وہ پسینہ پونچھ رہا تھا تو اُس کی آنکھوں میں باپ کی شفقت اور ہاتھوں میں بھائی کی محبت کام کر رہی تھی۔

صورتِ حال کے یہ تمام تغیرات اِس تیزی سے ظہور میں آئے کہ ابنِ ساباط کا دماغ مختل ہو کر رہ گیا۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکا کہ معاملہ کیا ہے؟ ایک مدہوش اور بے ارادہ آدمی کی طرح اس نے اجنبی کے اشارہ کی تعمیل کی اور چٹائی پہ بیٹھ گیا۔ اب اُس نے دیکھا کہ واقعی اجنبی نے کام شروع کر دیا ہے۔ اُس نے

"... ... مگر پھر یہ شخص ہے کون؟ ... ..."

اچانک ایک نیا خیال اُس کے اندر پیدا ہوا۔ وہ ہنسا۔ "استغفراللہ" میں بھی کیا احمق ہوں۔ یہ بھی کوئی سوچنے اور حیران ہونے کی بات تھی، معاملہ بالکل صاف ہے تعجب ہے مجھے پہلے کیوں خیال نہیں ہوا! یقیناً یہ بھی کوئی میرا ہی ہم پیشہ آدمی ہے۔ اور اسی نواح میں رہتا ہے۔ اتفاقات نے آج ہم دونوں چوروں کو ایک ہی مکان میں جمع کر دیا ہے۔ چونکہ یہ اسی نواح کا آدمی ہے اس لیئے اس مکان کے تمام حالات سے واقف ہوگا۔ اُسے معلوم ہوگا کہ آج مکان رہنے والوں سے خالی ہے اور یہ اطمینان کام کرنے کا موقعہ ہے۔ اسی لیئے وہ روشنی کا سامان ساتھ لیے آیا لیکن جب دیکھا کہ میں پہلے سے پہنچا ہوا ہوں تو آمادہ ہوگیا کہ میرا ساتھ دے۔ مگر ایک حصہ کا حقدار بن جائے۔ ... ..."

وہ ابھی سوچ رہا تھا کہ دروازہ کھُلا اور اجنبی ایک لکڑی کا بڑا سا پیالہ ہاتھ میں لیے نمودار ہوگیا۔

"یہ لو! میں تمہارے لیے دودھ لے آیا ہوں اسے پی لو۔ یہ بھوک اور پیاس دونوں کے لیے مفید ہوگا۔" اُس نے کہا اور پیالہ ابن ساباط کو پکڑا دیا۔ ابن ساباط واقعی بھوکا پیاسا تھا۔ بلا تامل منہ کو لگایا اور ایک ہی مرتبہ میں ختم کر دیا۔

اب ابنِ سباباط تنہا تھا لیکن تنہا ہونے پر بھی اُس کے قدموں میں حرکت نہ ہوئی۔ اجنبی کے طرزِ عمل میں کوئی بات ایسی نہ تھی جس سے اِس کے اندر خوف پیدا ہوتا۔ وہ صرف متحیّر اور مبہوت تھا۔

اجنبی کی ہستی اور اُس کا طور طریقہ ایسا عجیب و غریب تھا کہ جب تک وہ موجود رہا ابنِ سباباط کو تحیّر و تاثر نے سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ دی۔ اجنبی کی شخصیت کی تاثیر سے اِس کی دماغی شخصیت مغلوب ہوگئی تھی۔ لیکن اب وہ تنہا ہوا تو آہستہ آہستہ اُس کا دماغ اپنی اصلی حالت پر واپس آنے لگا یہاں تک کہ تمام دماغی خصائل پوری طرح اُبھر آئے اور وہ اُسی روشنی میں معاملات کو دیکھنے لگا جس روشنی میں دیکھنے کا ہمیشہ سے عادی تھا۔

وہ جب اجنبی کا متبسّم چہرہ اور دلنواز صدائیں یاد کرتا تو شک اور خوف کی جگہ اُس کے اندر ایک ایسا ناقابلِ فہم جذبہ پیدا ہو جاتا جو آج تک اُسے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا لیکن پھر بھی جب وہ سوچتا کہ اِس تمام معاملہ کا مطلب کیا ہے؟ اور یہ شخص ہے کون؟ تو اُس کی عقل حیران رہ جاتی اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی

اُس نے اپنے دِل میں کہا "یہ تو قطعی ہے کہ یہ شخص اِس مکان کا مالک نہیں ہے۔ مکان کے مالک کبھی چوروں کا استقبال نہیں کیا کرتے۔

"بے وقوف! چپ کیوں ہے؟ یہ نہ سمجھنا کہ دودھ کا ایک پیالہ پلاکر، اور چکنی چپڑی باتیں کر کے تم مجھے احمق بنالو گے۔ تم نہیں جانتے میں کون ہوں؟ مجھے کوئی احمق نہیں بنا سکتا۔ میں ساری دنیا کو احمق بنا چکا ہوں۔ بولو۔ اس پر راضی ہو یا نہیں؟ اگر نہیں ہو تو .. .. .."

لیکن ابھی اُس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اجنبی کے لب متحرک ہوتے۔ اب بھی اُس کے لبوں سے اُس کی مسکراہٹ نہیں ہٹی تھی۔

"میرے عزیز دوست! کیوں بلا وجہ اپنی طبیعت آزردہ کرتے ہو؟ آؤ یہ کام جلد نپٹا لیں جو ہمارے سامنے ہے۔ دیکھو! میں نے دو گٹھڑیاں باندھ لی ہیں۔ ، ایک چھوٹی ہے، ایک بڑی ہے۔ تمھارا ایک ہاتھ ہے۔ اس لیے تم زیادہ بوجھ نہیں سنبھال سکتے۔ لیکن میں دونوں ہاتھوں سے سنبھال لوں گا۔ چھوٹی گٹھڑی تم اٹھالو، بڑی میں اٹھا لیتا ہوں۔ باقی رہا میرا حصہ، جس کے خیال سے تمھیں اتنی آزردگی ہوتی ہے۔ تو میں بھی نہیں چاہتا۔ اس وقت اُس کا فیصلہ کر دوں۔

تم نے کہا ہے کہ ——— تم ہمیشہ کے لیے مجھ سے معاملہ کر سکتے ہو۔ مجھے ایسا ہی معاملہ پسند ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ تم

اب اُسے معاملہ کی فکر ہوئی۔ اتنے دیر کے وقفہ نے اُس کی طبیعت بحال کر دی تھی۔

"دیکھو! اگرچہ میں تم سے پہلے یہاں پہنچ چکا تھا اور ہاتھ لگا چکا تھا۔ اور اِس لیے ہم لوگوں کے قاعدہ کے بموجب تمھارا کوئی حق نہیں۔ لیکن تمھاری ہشیاری اور مستعدی دیکھ لینے کے بعد مجھے کوئی تامّل نہیں کہ تمھیں بھی اس مال میں شریک کروں۔ اگر تم پسند کرو گے تو میں ہمیشہ کے لیے تم سے معاملہ کر لوں گا۔ لیکن دیکھو، یہ میں کہے دیتا ہوں کہ آج جو کچھ بھی یہاں سے لے جائیں گے اُس میں تم برابر کا حصہ نہیں پا سکتے۔ کیونکہ در اصل آج کا کام میرا ہی کام تھا۔" اُس نے صاف آواز میں کہا۔ اُس کی آواز میں اب تاثر نہیں تھا، تحکم تھا۔

اجنبی مسکرایا۔ اُس نے ابنِ ساباط پر ایک ایسی نظر ڈالی جو اگرچہ شفقت و مہر سے خالی نہ تھی لیکن اِس کے علاوہ بھی اُس میں کوئی چیز تھی۔ لیکن ابنِ ساباط سمجھ نہ سکا۔ اُس نے خیال کیا۔ شاید یہ شخص اِس طریقِ تقسیم پر قانع نہیں ہے۔ اچانک اُس کی آنکھوں میں اُس کی خوفناک مجرمانہ زندگی چمک اٹھی۔ وہ غصہ سے مضطرب ہو کر کھڑا ہو گیا۔

اتنا بھاری بوجھ اٹھا کر چلنا نہایت دشوار تھا۔ لیکن ابنِ ساباط کو قدرتی طور پر عجلہ ہی تھی۔ وہ بار بار حاکمانہ انداز سے اصرار کرتا کہ تیز چلو اور چونکہ خود اس کا بوجھ بہت ہلکا تھا اس لیے خود تیز چلنے میں کسی طرح کی دشواری محسوس نہیں کرتا تھا۔ اجنبی تعمیلِ حکم کی پوری کوشش کرتا لیکن اتنا بھاری بوجھ اٹھا کر دوڑنا انسانی طاقت سے باہر تھا۔ اس لیے پوری کوشش کرنے پر بھی زیادہ تیز نہیں چل سکتا تھا۔ کئی مرتبہ ٹھوکریں لگیں۔ بارہا بوجھ گرتے گرتے رہ گیا۔ ایک مرتبہ اتنی سخت چوٹ کھائی کہ قریب تھا گر جائے پھر بھی اس نے رکنے یا ستانے کا نام نہیں لیا۔ گرتا پڑتا اپنے ساتھی کے ساتھ بڑھتا ہی گیا۔

لیکن ابنِ ساباط اس پر بھی خوش نہ تھا۔ اُس نے پہلے تو ایک دو مرتبہ تیز چلنے کا حکم دیا۔ پھر بے تامل گالیوں پر اتر آیا۔ ہر لمحہ کے بعد اسے ایک سخت گالی دیتا اور کہتا تیز چلو۔ اتنے میں جسر (پل) آیا۔ یہاں چڑھائی تھی۔ جسم کمزور اور تھکا ہوا، بوجھ بے حد بھاری، اجنبی سنبھل نہ سکا اور بے اختیار گر پڑا۔ ابھی وہ اٹھنے کی کوشش کر رہی تھا کہ اُوپر سے ایک سخت لات پڑی۔ ابن ساباط کی لات تھی۔ اُس نے غضبناک ہو کر

ہمیشہ کے لیے مجھ سے معاملہ کر لو۔"

"ہاں! اگر یہ بات ہے تو پھر سب کچھ ٹھیک ہے۔ تمھیں ابھی معلوم نہیں، میں کون ہوں؟ پورے ملک میں تمھیں مجھ سے بہتر کوئی سردار نہیں مل سکتا۔" اُس نے بڑی گٹھڑی اٹھانے میں اجنبی کو مدد دیتے ہوئے کہا۔

یہ گٹھڑی اس قدر بھاری تھی کہ ابنِ ساباط اپنی حیرانی نہ چھپا سکا۔ وہ اگرچہ اپنے نئے رفیق کی زیادہ جرأت افزائی کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ پھر بھی اُس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔

"دوست! تم دیکھنے میں تو بڑے دُبلے پتلے ہو لیکن بوجھ اُٹھانے میں بڑے مضبوط نکلے۔" ساتھ ہی اُس نے اپنے دل میں کہا۔ "یہ جتنا مضبوط ہے اتنا عقل مند نہیں ہے ورنہ اپنے حصے سے دست بردار نہ ہو جاتا۔ اگر آج یہ احمق نہ مل جاتا تو مجھے سارا مال چھوڑ کر صرف ایک دو تھانوں پر قناعت کرنی پڑتی۔"

اب ابنِ ساباط نے اپنی گٹھڑی اُٹھائی جو بہت ہی ہلکی تھی۔ اور دونوں باہر نکلے۔ اجنبی کی پیٹھ جس میں پہلے سے خم موجود تھا —— اب گٹھڑی کے بوجھ سے بالکل ہی جھک گئی تھی۔ رات کی تاریکی میں اتنا

اعتماد کرے کہ اپنا اصلی محفوظ مقام دکھا دے۔

جس جگہ یہ دونوں کھڑے تھے، دراصل ایک ناتمام ایوان تھا۔ یا تو اِس پر پوری چھت پڑی ہی نہ تھی یا پرانی تھی تو امتدادِ وقت سے شکستہ ہو کر گر پڑی تھی۔ ایک طرف بہت سے پتھروں کا ڈھیر تھا۔ ابنِ ساباط انہی پتھروں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ دونوں گٹھڑیاں سامنے دھری تھیں۔ ایک گوشہ میں اجنبی کھڑا ہانپ رہا تھا۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی۔

یکایک اجنبی بڑھا اور ابنِ ساباط کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب رات ختم ہونے پر تھی۔ پچھلے پہر کا چاند درخشاں تھا۔ کھلی چھت سے اُس کی شعاعیں ایوان کے اندر پہنچ رہی تھیں۔ ابن ساباط دیوار کے سائے میں تھا۔ لیکن اجنبی جو اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا ٹھیک چاند کے مقابل تھا۔ اِس لیے اُس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ابن ساباط نے دیکھا کہ تاریکی میں ایک

کہا۔

"اگر اتنا بوجھ سنبھال نہیں سکتا تھا تو لاد کر لایا کیوں ۔۔۔؟"

اجنبی کانپتا ہوا اٹھا۔ اُس کے چہرہ پر درد نقاہت کی جگہ شرمندگی کے آثار پائے جاتے تھے۔ اُس نے فوراً گٹھڑی اٹھا کر پیٹھ پر رکھی اور پھر روانہ ہو گیا۔

اب یہ دونوں شہر کے کنارے ایک ایسے حصّہ میں پہنچ گئے۔ جو بہت ہی کم آباد تھا۔ یہاں ایک ناتمام عمارت کا پرانا اور شکستہ احاطہ تھا۔ ابنِ ساباط اِس احاطہ کے جانب پہنچ کر رک گیا اور اجنبی سے کہا یہیں بوجھ اتار دو۔ پھر کود کر اندر گیا۔ اور اجنبی نے باہر سے دونوں گٹھڑیاں اندر پھینک دیں۔ اِس کے بعد اجنبی بھی کود کر اندر ہو گیا اور دونوں عمارت کے اندرونی حصّہ میں پہنچ گئے۔ اِس عمارت کے نیچے ایک پُرانا سرداب (تہہ خانہ) تھا۔ جس میں ابنِ ساباط نے قید خانے سے نکل کر پناہ لی تھی۔ لیکن اس وقت وہ سرداب میں نہیں اُترا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اجنبی پر ابھی اِس درجہ

بتلا دینا چاہتا ہوں کہ میں وہ نہیں ہوں جو تم نے
خیال کیا ہے۔ میں اُسی مکان میں رہتا ہوں جہاں آج تم
سے ملاقات ہوئی تھی اور تم نے میری رفاقت قبول کر
لی تھی۔ میری عادت ہے کہ رات کو تھوڑی دیر کے
لیے اُس کمرے میں جایا کرتا ہوں جہاں تم بیٹھے تھے
آج آیا تو دیکھا، تم اندھیرے میں بیٹھے ہو اور تکلیف
اٹھا رہے ہو۔ تم میرے گھر میں عزیز مہمان تھے،
افسوس میں آج اس سے زیادہ تمھاری تواضع اور
خدمت نہ کر سکا۔ تم نے میرا مکان دیکھ لیا ہے۔
آئندہ جب کبھی تمھیں ضرورت ہو تم بلا تکلف اپنے
اپنے رفیق کے پاس چلے آ سکتے ہو۔ خدا کی سلامتی
اور برکت ہمیشہ تمھارے ساتھ رہے۔"

یہ کہا اور آہستگی سے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مصافحہ کیا اور تیزی کے ساتھ نکل کر روانہ ہو گیا۔

اجنبی خود تو روانہ ہو گیا لیکن ابنِ ساباط کو ایک دوسرے

درخشاں چہرہ، ایک نورانی تبسم، ایک پُر اسرار اندازِ نگاہ کی دلآویزی سامنے ہے۔

"میرے دوست اور رفیق!" اجنبی نے اپنی اسی دلنواز اور شیریں آواز میں جو دو گھنٹے پہلے ابن سا باط کو بے خود کر چکی تھی! کہنا شروع کیا:-

> "میں نے اپنی خدمت پوری کر لی ہے۔ اب میں تم سے رخصت ہوتا ہوں۔ اِس کام کے کرنے میں مجھ سے جو کمزوری اور سستی ظاہر ہوئی ہے اور اُس کی وجہ سے بار بار تمھیں پریشان خاطر ہونا پڑا اُس کے لیے میں بہت شرمندہ ہوں اور تم سے معافی چاہتا ہوں۔ مجھے امید ہے تم معاف کر دو گے۔ :
>
> اِس دنیا میں ہماری کوئی بات بھی خدا کے کاموں سے اِس قدر ملتی جلتی نہیں ہے جس قدر یہ بات کہ ہم ایک دوسرے کو معاف کر دیں اور بخش دیں۔ لیکن قبل اِس سے کہ میں تم سے الگ ہوں، تمھیں

اُس کے لیے دنیا کی سب سے زیادہ نفرت انگیز چیز ہو گئی تھی، اب اُسے محسوس نہیں ہوتا۔ اُس کے دماغ کی ساری قوّت صرف ایک نقطہ میں سمٹ آتی ہے اور وہ رات والے عجیب و غریب اجنبی کی صورت ہے۔ وہ خود تو اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی مگر اُسے ایک ایسے عالم کی جھلک دکھا دی۔ جو اب تک اُس کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔

اُس کی ساری زندگی گناہ اور سیہ کاری میں بسر ہوئی تھی۔ اُس نے انسانوں کی نسبت جو کچھ دیکھا سنا تھا وہ یہی تھا کہ :-

انسان خود غرضی کا پُتلا اور نفس پرستی کی مخلوق ہے۔ وہ نفرت سے منہ پھیر لیتا ہے، بے رحمی سے ٹھکرا دیتا ہے، سخت سے سخت سزائیں دیتا ہے۔

لیکن ـــــــ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ محبت بھی کرتا ہے اِس میں فیاضی، بخشش اور قربانی کی بھی روح ہو سکتی ہے۔

ہی عالم میں پہنچا دیا۔ اب وہ مبہوت اور مدہوش تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں وہ اُسی طرف تک رہی تھیں جس طرف سے اجنبی رو آ ہوا تھا لیکن معلوم نہیں اُسے کچھ سوجھائی بھی دیتا تھا یا نہیں ؟

دوپہر ڈھل چکی ہے۔ بغداد کی مسجدوں سے جوق در جوق نمازی نکل رہے ہیں۔ دوپہر کی گرمی نے امیروں کو تہ خانوں میں اور غریبوں کو دیواروں کے سائے میں بٹھا دیا تھا۔ اب دونوں نکل رہے ہیں ایک تفریح کے لیے دوسرا مزدوری کے لیے۔ لیکن ابن ساباط اِس وقت تک وہیں بیٹھا ہے جہاں صبح بیٹھا تھا۔ رات والی دونوں گٹھڑیاں سامنے پڑی ہیں اور اُس کی نظریں اُن میں گڑی ہوئی ہیں۔ گویا اُن کی شکنوں کے اندر اپنے رات والے رفیق کو ڈھونڈھ رہا ہے۔

بارہ گھنٹے گزر گئے لیکن جسم اور زندگی کی کوئی ضرورت اسے محسوس نہیں ہوئی۔ وہ بھوک جس کی خاطر اُس نے اپنا ایک ہاتھ کٹوا دیا تھا اب اُسے نہیں ستاتی۔ وہ خوف جس کی وجہ سے سورج کی روشنی

پر پڑی اور وہ بہ یک دفعہ تاریکی سے نکل کر روشنی میں آ گیا۔

اجنبی کی شخصیت اپنی پہلی ہی نظر میں اُس کے دل تک پہنچ چکی تھی لیکن وہ جہالت و گمرہی سے اِس کا مقابلہ کرتا رہا۔ اور حقیقت کے فہم کے لیے تیار نہیں ہوا۔ لیکن جوں ہی اجنبی کے آخری الفاظ نے وہ پردہ ہٹا دیا جو اُس نے اپنی آنکھوں پر ڈال لیا تھا، حقیقت اپنی پوری شانِ تاثیر کے ساتھ بے نقاب ہو گئی اور اب اِس کی طاقت سے باہر تھا کہ اِس تیر کے زخم سے سینہ بچا لے جاتا۔

اُس نے اپنی جہالت سے پہلے خیال کیا تھا۔ اجنبی بھی میری ہی طرح کا ایک چور ہے اور اپنا حصہ لینے کے لیے میری رفاقت و اعانت کر رہا ہے۔ اُس کا ذہن یہ تصور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ بغیر غرض اور انتفاع کے ایک انسان دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کر سکتا ہے۔ لیکن جب اجنبی نے چلتے وقت بتلایا کہ وہ چور نہیں بلکہ اُسی مکان کا مالک ہے جس کا مال و متاع غارت کرنے کے لیئے وہ گیا تھا تو اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے یکایک ایک بجلی آسمان سے گر پڑی ہو۔

بچپن میں اُس نے بھی خدا کا نام سُنا تھا اور لوگوں کو خدا پرستی کرتے دیکھا تھا۔ لیکن جب زندگی کی کشاکش کا میدان سامنے کھلا تو اُس کا عالم ہی دوسرا تھا۔ اُس نے قدم دیا اور حالات کی رفتار جس طرف لے گئی، بڑھے گیا۔

نہ تو خود اُسے کبھی مہلت ملی کہ خدا پرستی کی طرف متوجہ ہوتا اور نہ انسانوں نے کبھی اِس کی ضرورت محسوس کی کہ اُسے خدا سے آشنا کرتے۔ جُوں جُوں اُس کی شقاوت بڑھتی گئی سوسائٹی اپنی سزا بھی بڑھاتی گئی سوسائٹی کے پاس اُس کی شقاوت کے لیے بے رحمی تھی۔ اس لیے یہ بھی دنیا کی ساری چیزوں میں سے صرف بے رحمی کا خوگر ہو گیا۔

لیکن اب اچانک اُس کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔

"—— آسمان کے سُورج کی طرح محبت کا بھی ایک سورج ہے
یہ جب چمکتا ہے تو رُوح اور دل کی ساری تاریکیاں دُور
ہو جاتی ہیں ——"

اب یکایک اِس سُورج کی پہلی کرن ابنِ ساباط کے دل کے تاریک گوشوں

کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ابنِ ساباط بھی اپنے غیر آباد گوشہ سے اٹھا، چادر جسم پر ڈالی اور بغیر کسی جھجک کے باہر نکل گیا۔

اب اِس کے دِل میں خوف نہیں تھا کیونکہ خوف کی جگہ ایک دوسرے ہی جذبہ نے لے لی تھی۔ وہ کرخ کے اُسی حصّہ میں پہنچا جہاں رات گیا تھا۔ رات والے مکان کے پہچاننے میں اُسے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ مکان کے پاس ہی ایک لکڑہارے کا جھونپڑا تھا۔ یہ اُس کے پاس گیا اور پوچھا۔

"یہ جو سامنے بڑا سا احاطہ ہے، اس میں کون تاجر رہتا ہے؟"

تاجر ——— ؟

بوڑھے لکڑہارے نے تعجب کے ساتھ کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تم یہاں کے رہنے والے نہیں ہو۔ یہاں تاجر کہاں سے آیا۔

"——— یہاں تو شیخ جنید بغدادیؒ رہتے ہیں ———"

ابنِ ساباط اِس نام کی شہرت سے بے خبر نہ تھا لیکن صورت آشنا نہ تھا۔ ابنِ ساباط مکان کی طرف چلا۔ رات کی طرح اِس وقت بھی

"یہ چور نہیں تھا۔ مکان کا مالک تھا۔ لیکن اُس نے چور کو پکڑنے اور سزا دلانے کی جگہ اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟" یہ "اِس "کیا سلوک کیا؟" کا جواب اُس کی روح کے لیے ناسور اور اُس کے دِل کے لیے ایک دہکتا ہُوا انگارا تھا۔ وہ جس قدر سوچتا، روح کا زخم گہرا ہوتا جاتا اور دل کی تپش بڑھتی جاتی۔ اِس تمام عرصہ میں اجنبی کے ساتھ جو کچھ گزرا تھا، اُس کا ایک ایک واقعہ، ایک ایک حرف یاد کرتا اور ہر بات کی یاد کے ساتھ ایک تازہ زخم کی چبھن محسوس کرتا۔ جب ایک مرتبہ حافظہ میں یہ سرگزشت ختم ہو جاتی تو پھر نئے سرے سے یاد کرنا شروع کر دیتا اور آخر تک پہنچ کر پھر ابتدا کی طرف لوٹتا۔

"مَیں چور تھا ــــ مَیں اس کا مال و متاع غارت کرنا
چاہتا تھا ــــ مَیں اُسے بھی چور سمجھا، اسے گالیاں دیں،
بے رحمی سے ٹھوکر لگائی ــــ مگر اُس نے میرے ساتھ
کیا سلوک کیا؟ ــــ ہر مرتبہ اِس آخری سوال کا
جواب سوچتا اور یہی سوال دہرانے لگتا۔

سورج ڈوب رہا تھا، بغداد کی مسجدوں کے میناروں پر مغرب کی اذان

اِس واقعہ پر کچھ عرصہ گزر چکا ہے۔ شیخ احمد ابنِ ساباط کا شمار سیدالطائفہ کے حلقۂ ارادت کے اُن فقرا میں سے ہے جو سب میں پیش پیش ہیں۔ شیخؒ کہا کرتے تھے :۔

> " ابنِ ساباط نے وہ راہ لمحوں میں طے کر لی۔ جو دوسرے برسوں میں نہیں طے کر سکتے۔ "

ابنِ ساباط کو چالیس سال تک دنیا کی دہشت انگیز سزائیں نہ بدل سکیں۔ مگر محبت اور قربانی کے ایک لمحہ نے چور سے اہل اللہ بنا دیا۔

دروازہ کھلا تھا۔ یہ بے تامّل اندر چلا گیا۔ سامنے وہی رات والا ایوان تھا۔ یہ آہستہ آہستہ بڑھا اور دروازہ کے اندر نگاہ ڈالی۔ وہی رات والی چٹائی بچھی تھی۔ رات والا تکیہ ایک جانب دھرا تھا۔ تکیہ سے سہارا لگائے اجنبی بیٹھا تھا۔ تیس چالیس آدمی سامنے تھے۔ واقعی اجنبی تھا جسم نہیں تھا۔ شیخ جنید بغدادیؒ تھے۔

اِتنے میں عشاء کی اذان ہوئی۔ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب سب لوگ جا چکے تو شیخ بھی اٹھے۔ جونہی انہوں نے دروازہ کے باہر قدم رکھا۔ ایک شخص بے تابانہ بڑھا اور قدموں پر گر گیا۔ یہ ابنِ ساباط تھا۔ اُس کے دل میں سمندر کا تلاطم بند تھا۔ آنکھوں میں جو کبھی نم نہیں ہوئی تھیں دجلہ کی سوتیں بھر گئی تھیں۔ آنسوؤں کا سیلاب آجائے تو پھر کون سی کثافت ہے جو باقی رہ سکتی ہے؟

شیخ نے شفقت سے اس کا سر اٹھایا۔ یہ کھڑا ہو گیا مگر زبان نہ کھل سکی اور اب اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟

"جب نگاہوں کی زبان کھل جاتی ہے تو منہ کی زبان کی ضرورت نہیں رہتی۔"

امیر تیمور گورکانی "درۂ کانھول" میں جو گلاب و یاسمن کے سرخ سفید پھولوں کے ایک حسین ابر پارے سے چھپا ہوا تھا عیش و نشاط اور ناؤ نوش میں مشغول تھا۔ یکایک اس بزم نوشا نوش کے مترنم اور خوشگوار ہنگاموں میں ایک آواز آئی۔ یہ آواز ایک عورت کی تھی جو ایک غضبناک شیرنی کی آواز کی طرح سنائی دی:

تیمور کے انتقام جو اور زخمی دل کو، جو اس کے فرزند دلبند کے ضائع ہو جانے کے سبب سے تمام دنیا والوں کے خلاف غیظ و غضب سے لبریز ہو گیا تھا، یہ آواز ایک آشنا سی آواز معلوم ہوئی۔ جام عشرت

اتفاق

اتفاق، آہ تم کیا جانو اتفاق کیا ہے؟ اتفاق ایک سفید کبوتر ہے۔
جو اپنی چونچ میں زیتون کی شاخ لیے ہوئے نا اتفاقی کے طوفان سے
نجات دلانے کی خوشخبری سنا رہا ہے۔

اتفاق چہچہاتی ہوئی ایک بلبل ہے اور اپنے شیریں راگوں سے غم زدہ
دلوں میں طرب پیدا کر رہی ہے۔

اتفاق خوب صورت عندلیب ہے، آسمان میں اڑتی چلی جاتی ہے
اور وہاں سے نسیم جنت بن کر واپس آتی ہے۔

اتفاق آسمانی فرشتہ ہے جو اپنے نورانی پر ہمارے زخموں پہ پھیلا دیتا ہے

کو مغلوب کیا ہے! بتا تو کیا چاہتی ہے؟" تیمور نے کہا۔

"سُن اے امیر! تو جو کچھ بھی ہے اور جس حیثیت میں بھی ہے پھر بھی ایک آدمی ہے لیکن میں — آہ، میں ایک ماں ہوں! تو موت اور ہلاکت کی خدمت کرتا ہے، میں زندگی اور سلامتی کی خدمت کرتی ہوں۔ تو انسان کو ہلاک کرتا ہے میری گود میں اس کی پرورش ہوتی ہے۔ مجھے بتلایا گیا ہے کہ تیرے عقیدے میں انصاف کرنا توانائی میں داخل ہے مگر مجھے یقین نہیں آتا اور نہیں آئے گا جب تک تو میری فریاد کو، میری داد کو نہیں پہنچے گا۔" عورت نے کمال تمکین و وقار کے لہجے میں کہا۔ "اس لیے کہ میں ایک ماں ہوں، ایک دکھیاری ماں!!"

تیمور نے عورت کی بے خوفی اور بے پروائی کو حیرت سے دیکھا، اس کو بیٹھنے کی اجازت دی۔ "میں سُن رہا ہوں تم اپنا واقعہ سناؤ!"

عورت شہنشاہ کے سامنے چار زانو ہو بیٹھی اور کہنے لگی۔

"امیر! میں سالرمو کی رہنے والی ہوں۔ تو نے ہرگز اس جگہ کا نام نہ سُنا ہوگا کیونکہ وہ دُور ہے۔ یہاں سے بہت دور۔ میرا باپ اور شوہر ماہی گیر تھے۔ ایک دن بحری قزاقوں نے چھاپا مارا اور دونوں قتل کر ڈالے گئے

اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اُس کے لبوں پر ایک اضطراری لہر دَوڑ گئی۔ یہ لہر کہہ رہی تھی۔ "یہ دلخراش آواز کہاں سے آئی؟"

حکم کی تعمیل" بندگانِ دولت" کی گھبراہٹ نے کی جو چاروں طرف دَوڑ گئے تھے۔ شہنشاہ کو جواب ملا۔ "یہ ایک دیوانی عورت کی آواز ہے جو کسی طرح یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ شکل و صورت سے فقیرنی معلوم ہوتی ہے۔ عربی میں گفتگو کرتی ہے اور "فرمانروائے بحر و بر" کی آستاں بوسی کی خواہشمند ہے۔"

"فوراً حاضر کی جائے!!"

تیمور نے حکم دیا اور عورت خیمہ میں داخل ہوئی۔ برہنہ پا، پھٹے ہوئے کپڑے، سینہ چھپانے کے لیے اپنی زلفیں بکھیرے ہوئے۔ چہرہ کا رنگ اُڑا ہوا۔ بغیر کسی کپکپاہٹ کے، جو ایسے باجاہ، و جلال اور ہیبتناک شہنشاہ کی موجودگی کا ادنیٰ سا خراج تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ شہنشاہ کی طرف پھیلا دیئے اور بیباکانہ، خود فراموشانہ لہجہ میں گویا ہوئی۔

"کیا تو ہی وہ فرمانروا ہے جس نے سلطان بایزید کو مغلوب کیا۔؟"

"ہاں میں ہی ہوں۔ مَیں نے ہی بایزید کو اور بایزید ایسے کئی بادشاہوں

پاتے ہیں۔ پھول، آفتاب کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔ نیک بختی محبت کے بغیر نصیب
نہیں ہوتی۔ محبت عورت کے بغیر ممکن نہیں اور کوئی بھی ماں کے بغیر پیدا نہیں
ہوسکتا ۔۔۔! ماؤں کی سبھی پرستش کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ وہ بہا سے
سے بڑے سے بڑے آدمی پیدا کرتی ہیں۔ اور آدمیوں کو بلند مرتبہ پر پہنچاتی ہیں۔

تیمور اُس عورت کی باتوں سے کسی گہری فکر میں چلا گیا۔ پھر سر اُٹھا کر اُس نے حکم دیا کہ تین سو شہسوار اس لڑکے کی تلاش میں روانہ ہو جائیں۔ "جو شخص ڈھونڈ کر لائے گا اسے انعام دیا جائے گا۔" پھر اُس نے آہ بھر کر کہا۔

چونکہ وہ ماں ہے! ایک محبت کرنے والی ماں۔ اور کوئی ماں نہیں ہوتی جو محبت نہ کرتی ہو۔ لڑکے کے کھو جانے سے اُس کے دل میں آگ سی بھڑک رہی ہے۔ ایسی آگ! جو برسوں تک قرنوں تک شرارے چھوڑ سکتی ہے۔"

* * *

اس احساس سے زیادہ خوشگوار احساس شاید کوئی نہیں، جو ماں کے دل میں اپنے بچہ کو کھلانے کے وقت پیدا ہوتا ہے۔ اس احساس سے زیادہ الم ناک احساس کوئی نہیں جو ماں اپنے بچہ کو تکلیف میں دیکھ کر محسوس کرتی ہے۔ اس بارے میں عورت مرد سے کہیں زیادہ زندگی اور زندگی کا شعور رکھتی ہے۔

میرے۔" — اُس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔" میرے لختِ جگر کو جو نہایت ہی خوب صورت تھا۔" — تیمور کے منہ سے آہ گئی۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ... خوب صورت — میرے لڑکے جہانگیر کی طرح! آہ۔"

عورت نے اپنا قصہ جاری رکھتے ہوئے اور آنکھوں سے سیلاب درد بہاتے ہوئے کہا۔ "بے رحم قزاق میرا لڑکا پکڑ لے گئے، آج چار سال! آہ پورے چار سال گزر رہے ہیں کہ مَیں دیوانہ وار چاروں طرف پھرتی ہوں مگر کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ مَیں سمجھتی ہوں کہ میرا لڑکا تیرے پاس ہے۔ کیونکہ بایزید کے لشکر نے اُن بحری قزاقوں کو گرفتار کر لیا تھا اور تو نے بایزید کو شکست دے کر اس کا سب کچھ چھین لیا۔ ضرور ہے کہ میرا لڑکا تیرے پاس ہوگا اور اس لیے میں چاہتی ہوں کہ اسے میرے سپرد کر دے۔!"

حاضرین دربار عورت کی باتوں پر ہنس پڑے۔ "یہ دیوانی ہو گئی ہے۔"

شاعر کرمانی نے کہا۔ "ہاں یہ دیوانی ہے — مگر ایک ماں کی طرح!"

آہ، ماں کی محبت! — ماں کی ہمیں پرستش کرنی چاہیے۔ دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں ہے جو ماں کی محبت کے راستہ میں حائل اور مانع ہو سکے! انسان کے تمام کامل صفات و حسنات — سب ماں کے دودھ کی چھاؤں میں پرورش

انسانی زندگی کی تمام شقاوتیں اور مصیبتیں صرف اس لیے موجود ہیں کہ سوسائٹی کا نظام اور اخلاق غلط ہے۔ اس کے پاس رحم، محبت، عفو اور اصلاح کے لیے تو کوئی جذبہ نہیں، لیکن وہ قانون اور سزا پر پورا اعتقاد رکھتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو جرم اور مصیبت سے بچانے کے لیے وہ کچھ نہیں کر سکتی، لیکن جرم پر سزا دینے اور مصیبت پر نفرت کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے!

ایک شخص جو اپنی یا اپنے عزیزوں کی بھوک سے عاجز آکر چوری کرتا ہے، یا نیکی اور خدا پرستی کی تعلیم نہ ملنے کی وجہ سے گمراہ ہو جاتا ہے، اُسے کتنی ہی سزائیں دی جائیں، وہ جرم کرتا ہی رہے گا۔ کیونکہ سزا نے نہ تو اس کی بھوک کا علاج کیا، نہ اس کی روح کی تاریکی کے لیے نیکی کی روشنی بہم پہنچائی۔ اس کا علاج رحم اور محبت ہے۔ مگر یہی چیز سوسائٹی کے پاس نہیں ہے!

وہ کہتا ہے، جرم اور گناہ روح کا زخم ہے۔ یہ محبت کے مرہم ہی سے اچھا ہو سکتا ہے۔ لیکن دنیا کے پاس مرہم نہیں ہے۔ صرف سزا کا تازیانہ ہے!

۱۰۰

کچھ عرصہ ہوا میں سفر میں تھا اور گذران وقت کے لیے یہ قصہ پڑھ رہا تھا۔ میں نے خیال کیا، وکٹر ہیوگو نے اپنے زورِ تخیل سے انسانی سیرت کا ایک بڑا ہی بلند اور دلآویز نقشہ کھینچا ہے، لیکن اگر اس نے مشرق کی شاعری کی طرح دیکھا [illegible] نے سعدی اور حافظ کا مطالعہ کیا تھا، مشرق کے اخلاق و تصوف کا بھی مطالعہ کیا ہوتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس طرح کی اخلاقی سیرت یہاں کی عملی زندگی کے واقعات رہ چکے ہیں۔ پھر مجھے [illegible] جنید بغدادیؒ اور ابن ساباط کا واقعہ کس درجہ اس سے مشابہ اور اپنی تفصیلات میں کیسا شاندار اور موثر ہے؟

(ابوالکلام آزاد)

میں!

اسی زمانہ میں ایسا اتفاق ہوا کہ فرانس کا ایک مشہور مجرم اٹھارہ برس کی سزا جھیل کر تولون کے قید خانہ سے رہا ہوا اور اسی قصبہ سے گزرا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ ایک پہر رات گزر چکی تھی۔ بھوک اور تھکن سے چور چور ہو رہا تھا۔ سارے قصبہ کا بار بار چکر لگایا کہ رات بھر کے لیے کہیں پناہ مل جائے مگر میسر نہ آئی۔

کون تھا جو ایسی قابل نفرت مخلوق کو اپنی چھت کے نیچے دیکھنا گوارا کرتا؟ مجبوراً اس نے ایک احاطہ کی شکستہ کوٹھڑی میں پناہ لی! لیکن وہ کتے کا گھر تھا۔ کتے نے بھی گوارا نہ کیا کہ اس کے ساتھ شب باش ہو! پھر اس نے سوچا۔ میرے لیے صرف قید خانہ ہی میں جگہ نکل سکتی ہے۔ وہ قصبہ کے قید خانہ کے دروازہ پر پہنچا اور بڑی عاجزی سے درخواست کی کہ رات بھر کے لیئے اسے جگہ دے دی جائے۔ لیکن دروازہ کے محافظ نے کہا: "یہ سرائے نہیں ہے، قید خانہ ہے۔ اگر یہاں آنا چاہتے ہو تو پہلے اپنے کو گرفتار کرا دو۔"

اس قصہ میں ایک نہایت ہی موثر سیرت (کیریکٹر) ایک قصبہ کے بشپ (بڑے پادری) کی ہے، اور اسی سے قصہ شروع ہوتا ہے۔ یہ بشپ رحم اور محبت کا پیکر تھا۔ انسان کی شقاوت اور مصیبت کے لیے اس کے دل میں نفرت کی جگہ رحمت تھی۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھا کہ انسانی روح نفرت و بغض سے نہیں بلکہ محبت اور فیاضی سے شکار کی جاسکتی ہے۔ وہ اپنی تمام بیش قرار تنخواہ بے نواؤں کی اعانت اور بیماروں کی تیمارداری میں خرچ کر ڈالتا اور کہتا "یہ میرے گھر کا خرچ ہے"۔ وہ اپنا تمام وقت ابنائے جنس کی خبر گیری و خدمت میں صرف کر دیتا اور کہتا، "یہ میرے اوقات کی تقسیم ہے"۔ جب کبھی کوئی بیمار پڑتا، یہ اس کے سرہانے پہنچ جاتا۔ جب کبھی کوئی مصیبت میں مبتلا ہوتا، یہ اس کے دروازہ پر دستک دیتا۔ جب کبھی کوئی مجرم گرفتار ہوتا، یہ اسے توبہ و انابت کی تسکین دینے میں مشغول نظر آتا!

اس کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا۔ ہر آنے والے کے لیے وہ ایک ہی آواز رکھتا تھا "اندر چلے آؤ" اس کی راتیں خدا کے تصور میں بسر ہوتی تھیں اور دن اس کے بندوں کی محبت تا

حال سے واقف ہوتے تو ایسا نہ کہتے،" لیکن بشپ کہتا ہے۔" میں تم سے واقف ہوں۔ کیونکہ تم میرے بھائی ہو!"

کھانے کے بعد وہ جین کے لیے اپنے کمرے کے ساتھ کا کمرہ تیار کرا دیتا ہے۔ چاندی کا شمع دان روشنی کے لیے رکھ دیتا ہے، اور شب بخیر کہہ کر رخصت ہو جاتا ہے۔

جین شکر گزار ہو کر سو جاتا ہے۔ عمر بھر میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ قید خانہ کے سخت اور ٹھنڈے فرش کی جگہ ایک نرم اور گرم بستر سے اس کا جسم مس ہوا تھا!

اب ایسا ہوتا ہے کہ پچھلے پہر اُس کی آنکھ کھلتی ہے۔ اس کا دماغ جو شام کی مصیبتوں سے تھک کر معطل ہو گیا تھا، کئی گھنٹے آرام پا کر اپنی اصلی حالت میں واپس آجاتا ہے اور اپنا گرد و پیش سوچنے لگتا ہے۔ اچانک اس کے خیالات میں جنبش ہوتی ہے۔ طمع و حرص کے مجرمانہ جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ جرم کا ذوق خفتہ بیدار ہو جاتا ہے۔ اسے یاد آتا ہے کہ کھانے کی میز پر چاندی کے قیمتی برتن موجود تھے۔ جو اسی کمرے میں ایک جگہ رکھے ہوئے

افسوس بدقسمت انسان! قید خانہ بھی اُسے پناہ نہیں دے سکتا۔
جب تک وہ جرم نہ کرے!

آخر اتفاقات اسے بشپ کے دروازہ پر پہنچاتے ہیں حسب معمول آواز آتی ہے۔ "اندر چلے آؤ" یہ مکان میں جاتا ہے اور اپنی داستان مصیبت سناتا ہے۔ بشپ ایک دوست اور بھائی کی طرح اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اور اپنے اور اپنے خاندان کے ساتھ میز پر بٹھا کر کھانا کھلاتا ہے گرم کمرہ، گرم غذا، آرام و عافیت سے رات بسر کرنے کا سامان، صورت حال کی یہ تبدیلی جین والجین کی طبیعت میں (کیونکہ رہا شدہ قیدی کا یہی نام تھا) شگفتگی پیدا کر دیتی ہے۔ وہ بشپ سے بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگتا ہے لیکن وہ سخت متعجب ہوتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ بشپ اُسے گفتگو میں "جناب" کر کے مخاطب کرتا ہے۔ اُس نے اپنی زبان سے لاکھوں مرتبہ دوسروں کو "جناب" کہا تھا، لیکن خود اپنے لیے یہ لفظ کبھی نہیں سنا تھا اُس کی ساری عمر قید خانے کے سپاہیوں کی گالیاں سننے میں بسر ہوئی۔
وہ حیران ہو کر کہتا ہے "میں ایک رہا شدہ قیدی ہوں۔ اگر تم میرے

کر لیا۔ شبہ کی تصدیق اس بقچہ سے ہوئی جو اس کی بغل میں تھا۔ اُس سے چاندی کے قیمتی برتن نکلے۔

یہی موقعہ بشپ کی سیرت (کیرکٹر) کی سب سے زیادہ موثر تصویر پیش کرتا ہے۔ جونہی بشپ کی نظر جین پر پڑی، بے تامل آگے بڑھا۔

"میرے دوست کیا تم ہو؟" بشپ نے کہا "میں تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ تم جاتے ہوئے اپنے شمع دان بھی چھوڑ گئے؟ حالانکہ وہ بھی تو چاندی کے ہیں" اُس نے چاندی کے لفظ پر زور دیا" اور کم سے کم دو سو روپیہ میں فروخت ہو سکتے ہیں؟"

پولیس افسر ایک دوسرے ہی طرح کے معاملہ کا متوقع تھا یہ صورت حال دیکھی تو گھبرا گیا۔

"تو کیا وہ بات ٹھیک تھی" پولیس افسر نے متعجب ہو کر کہا "جو اس شخص نے ہم سے بیان کی تھی؟ جب ہم نے اس سے دریافت کیا کہ یہ قیمتی سامان تمہیں کیونکر ملا؟ تو اس نے کہا کہ....."

ہیں۔ وہ اٹھتا ہے۔ پہلے بشپ کے کمرے میں جاتا ہے۔ نہیں معلوم جرم و گناہ کے کیسے خوفناک ارادے اس کے اندر کھول رہے تھے۔ لیکن جب بشپ کے ساکن اور نورانی چہرے پہ نظر پڑتی ہے تو جھجک کے رہ جاتا ہے۔ گھبراہٹ میں جلد جلد چاندی کے برتن اٹھاتا ہے، اور باغ کی دیوار پھاند کر روانہ ہو جاتا ہے!

بشپ صبح اٹھتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ اپنے مہمان کے لیے گھر کی گائے کا تازہ دودھ مہیا کرے۔ لیکن اتنے میں خادمہ آتی ہے اور خبر دیتی ہے کہ یہ "مہمان عزیز" چاندی کے تمام برتن لے کر بھاگ گیا۔ بشپ سنتا ہے، لیکن اس کی زبان سے شکایت کا ایک حرف نہیں نکلتا۔ وہ کہتا ہے۔ لکڑی یا لوہے کے برتن بھی اسی طرح کام دے سکتے ہیں جس طرح چاندی کے برتن، وہ بہ آسانی مہیا کر لیے جائیں گے۔

اتنے میں دروازہ کھلتا ہے اور پولیس کے سپاہی جین والجین کو گردن سے پکڑے نمودار ہوتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح یہ قصبہ سے نکل کر تیزی سے بھاگا جا رہا تھا۔ پولیس کے ایک سپاہی کو شبہ ہوا اور گرفتار

تم اس گھر میں ہمیشہ اس کے صدر دروازے سے داخل ہو سکتے ہو۔ رات ہو یا دن۔ وہ کبھی اندر سے بند نہیں کیا جاتا۔ صرف بھڑا دیا جاتا ہے۔"

جین نے بغیر اس کے کہ صورت حال سمجھ سکا ہو، ایک ایسے آدمی کی طرح جو اپنے ہوش و حواس میں نہ ہو، ہاتھ بڑھا دیا اور شمع دان لے لیے۔

اب بشپ ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور جین کے کان میں کہتا ہے:۔

"دیکھو یہ نہ بھولنا کہ تم نے مجھ سے آج کیا وعدہ کیا ہے! تم نے وعدہ کیا ہے کہ اس شمع دان کی قیمت سے ایک راست باز آدمی کی زندگی بسر کرو گے۔"

جین نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ وہ تو مبہوت اور دم بخود کھڑا تھا۔ بشپ نے اس کے کہنے کا انتظار نہیں کیا۔ اسے جو کہنا چاہیے تھا، وہ خود ہی اس کی طرف سے فرض کر لیا۔ قبل اس کہ منظر ختم ہو، بشپ کی زبان پھر کھلتی ہے۔ وہ جین کے کاندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھتا ہے اور کہتا ہے:۔

"جین والجین! میرے دوست! میرے عزیز بھائی! اب، تم زیادہ عرصہ تک برائی کی زندگی میں نہیں رہ سکتے۔ میں نے آج تمہاری روح تم

بشپ نے اس کی بات ختم ہونے کا انتظار نہیں کیا۔ خود ہی یہ کہہ کر پوری کر دی:۔

"اس نے کہا کہ یہ چیز مجھے ایک بوڑھے پادری نے دی تھی جس کے یہاں میں نے رات بسر کی تھی، مگر تم نے اس کی بات باور نہ کی اور گرفتار کر کے میرے پاس لے آتے۔ کیوں؟ یہی بات ہے؟ اگر یہی بات ہے تو تم نے غلطی کی۔"

پولیس افسر نے جین کو چھوڑ دیا۔ جین کی کند اور اکھڑ طبیعت کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ اس لطیف مگر حیرت انگیز طرزِ عمل کی نزاکت محسوس کر سکتا۔ صورت حال کی عجیب غیر متوقع، اور انقلابی نوعیت نے اسے مبہوت کر دیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں مگر اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بشپ اٹھا اور چاندی کے دونوں شمع دان جو اس کی چوری سے بچ رہے تھے۔ اُٹھا سامنے کر دیئے۔

"میرے دوست! یہ اپنی چیز لے لو اور خدا کے امن اور سلامتی کے ساتھ جاؤ۔ مگر دیکھو، جب کبھی تم واپس آؤ، تو یاد رکھنا۔ تمہارے لیے بالکل غیر ضروری ہے کہ باغ میں سے گزرنے کی تکلیف برداشت کرو

ہے۔ یہ اس کی زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ نفرت، حقارت اور سزا کی جگہ رحم، محبت اور عفو و بخشش کی دل نواز صدا اُس کے کانوں میں پڑی تھی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُسے معلوم ہوا، اس دنیا میں صرف "قانون" اور "سزا" ہی نہیں ہے بلکہ ان سے بھی ایک بالاتر حقیقت ہے جو "محبت" اور "قربانی" ہے اور جس کی وسعت اور گہرائیوں کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ کتنا ہی اس حقیقت کی تاثیر سے بچنا چاہتا لیکن یہ اس کا روح و دل زخمی کیے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ قیدخانہ تولون کا مشہور مجرم سہی، مگر پھر بھی انسان تھا۔ سانپ اور بھیڑیا نہ تھا۔ سانپ کا پھن اور بھیڑیے کا پنجہ بھی تو محبت اور فیاضی کے سامنے نہیں اٹھ سکتا؛ ناممکن تھا کہ وہ بشپ کی رحمت و قربانی سے اپنی شقاوت و معصیت کا مقابلہ نہ کرتا۔ اُس کا دل جسے سوسائٹی کی بے مہری، قانون کی سنگ دلی، اور زندگی کی محرومیوں نے پتھر کی طرح سخت کر دیا تھا۔ اب محبت کی دل نوازیوں سے بے اختیار پگھلنے لگا۔ سچ پچ کو اس کی روح اس کی نہیں رہی تھی۔ اُسے بشپ کی نگاہ محبت نے خرید لیا تھا۔ اس خرید و فروخت میں بشپ نے چند برتن کھوئے، لیکن جین نے اپنی پوری زندگی جو گم ہو چکی تھی واپس پالی۔ اگر

سے خرید لی ہے۔ میں اسے تاریکی سے نکال کر خدا کے حوالہ کرتا ہوں!"

(میں نے جب کبھی قصہ کا یہ حصہ پڑھا ہے، تو محسوس کیا ہے کہ کوئی چیز ضرورت سے زیادہ یہاں آگئی ہے۔ میں خیال کرتا ہوں، اگر وکٹر ہیوگو یہ منظر وہیں پر ختم کر دیتا جہاں بشپ نے شمع دان دے کر کہا تھا۔ "سلامتی کے ساتھ جاؤ" تو یہ تصویر کہیں زیادہ موثر اور مکمل ہوتی۔ اس سے زیادہ بشپ کو خود اپنی زبان سے کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس سیرت (کیریکٹر) کی ساری تاثیر اس کی حالت کی رفعت اور کیفیت میں ہے۔ صراحت اور وضاحت میں نہیں ہے۔ بسا اوقات عمل کی تائید ایک مقدس خاموشی ہوتی ہے جسے چھونا نہیں چاہئے۔ زبان کی گویائی اس میں مخل ہو سکتی ہے مگر اضافہ نہیں کر سکتی)

بہرحال جین یہاں سے نکلتا ہے، اور اب وہ وقت آتا ہے کہ زندگی بھر کے خواب گراں کے بعد، اچانک اس کی آنکھیں کھلتی ہیں اور وہ دیکھتا ہے کہ افکار و احساسات کی ایک بالکل نئی دنیا اس کے اندر پیدا ہو گئی

زیادہ نہیں! یونانی علم الاصنام کی ضرب المثل تھی: "مریخ کے مندر اور عطارد کے مندر میں صرف ایک دیوار حائل ہے" کیونکہ دونوں ایک ہی احاطہ میں تھے، اور جہل و خونریزی کے مندر سے نکل کر علم و امن کے مندر میں جانے کے لیے صرف اتنا کرنا پڑتا تھا کہ بیچ کے ایک دروازے سے نکل کر دوسرے دروازے میں قدم رکھ دیا۔ یہ اس طرف اشارہ تھا کہ علم و جہل، محبت و جنگ، اور نیکی و بدی کی دنیائیں کتنی ہی وسیع اور دور دراز نظر آتی ہوں، مگر اس کے لیے جو ایک سے نکل کر دوسری میں قدم رکھنا چاہے، اس سے زیادہ مسافت نہیں ہے کہ ایک گھر کی چوکھٹ سے نکلے اور دوسری چوکھٹ میں قدم رکھ دیا!

طے می شود ایں رہ بہ درخشیدن برقے
ما بے خبراں منتظر شمع و چراغیم!

بالآخر فرانس کا وہ مشہور مجرم جس کے لیے چوری پیشہ اور قتل تفریح تھی، جسے دنیا کا قانون اور سوسائٹی کا انصاف اٹھارہ برس عذاب میں رکھ کر بھی جرم سے روک نہیں سکا تھا، جس کی شقاوت اور سیہ کاری

بشپ جین کو قانون اور سزا کے حوالے کر دیتا تو کیا پاتا ! چاندی کے چند برتن جو اُس کے گھر سے چرائے گئے تھے۔ لیکن چاندی کے برتن زیادہ قیمتی ہیں یا خدا کے ایک بھٹکے ہوئے بندے کی خدا کی طرف واپسی ؟ بشپ کا فیصلہ یہ تھا کہ چاندی نہیں بلکہ انسان قیمتی ہے ؛ اس نے برتنوں کے ساتھ شمع دان بھی ملا دیئے۔ کیونکہ پھر بھی یہ سودا بہت ارزاں تھا!

نیکی اور بدی میں کشمکش شروع ہو گئی۔ مقابلہ سخت تھا، مگر جیت نیکی ہی کے لیے تھی۔ جین نے تاریکی اور گناہ کا دشت بے کنار پیچھے چھوڑا اور ایک ہی جست میں نیکی اور خدا پرستی کی بلندیوں پر پہنچ گیا :-

بال بکشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفسی!

نیکی کی دنیا بدی کی دنیا سے کس قدر دور معلوم ہوتی ہے اور پھر دیکھو تو کتنی نزدیک ہے ؟ جب تک تم نے اس کی طرف قدم نہیں اٹھایا، وہ اتنی دور رہے کہ اس کا نشان راہ بھی تمہیں دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن جونہی تم اس کی طرف چلے، وہ اتنی نزدیک ہو جاتی ہے کہ ساری مسافت ایک قدم سے

آئی۔ ایک کے بعد ایک آزمائشیں آتی گئیں۔ اور اس کی وہ نیکی جو بشپ نے شمع دان پکڑاتے ہوئے اس کے دل کے ریشے ریشے میں اتار دی تھی، متزلزل نہ ہوئی۔ وہ قربانیوں پر قربانیاں کرتا گیا۔ اس نے انسان کی خدمت اور محبت کے لیے اپنا سب کچھ دے دیا۔ لیکن انسان اسے انصاف کا ایک کلمہ، اعتراف کا ایک اشارہ، عزت کی ایک غلط انداز نظر بھی نہ دے سکا:

افسانہ بہت طول کھینچتا ہے۔ سالہا سال گزر جاتے ہیں۔ یورپ کے بعض اہم واقعات شروع ہوتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں، "واٹر لو" کا معرکہ اور "فرانس کا تیسرا انقلاب" بھی ہو چکتا ہے، لیکن جین کی عجیب و غریب زندگی کی مسلسل اور غیر منختتم قربانیاں ختم ہونے پر نہیں آتیں۔ وہ اپنی زندگی کا تمام آخری حصہ صرف کرکے جس یتیم اور مظلوم لڑکی کی پرورش کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی کی ساری نامرادیاں اور شقاوتوں کا صلہ اس بچہ کی محبت میں مل جائے گا، وہ بھی اس سے بے پرواہ ہو جاتی ہے۔ جس شخص کی زندگی کو وہ ایک ایسے زہرہ گداز

اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ قید خانہ سے نکلتے ہی پہلا وار اپنے محسن پر کر گزرا، اور ذرا بھی ضمیر کی ملامت محسوس نہ کی، اب ایک شریف، راستباز خدا پرست، اور فیاض آدمی تھا جس کی دولت بندگان خدا کی بے لوث خدمت میں اور جس کی زندگی مصیبت زدوں اور بے سر و سامانوں کی غمخواری میں صرف ہوتی تھی! اتنا ہی نہیں بلکہ گزشتہ کے احساس اور مستقبل کی طلب نے اب اس کے اندر نیکی اور ایثار کی ایک ایسی اعلیٰ روح پیدا کر دی تھی۔ جس کی طاقت کی کوئی انتہا اور جس کی وسعت کا کوئی کنارہ نہ تھا۔ بشپ کا نمونہ اسے اپنی روحانی بلندی کی سطح سے بھی ایک زیادہ بلندی کی طرف دعوت دے رہا تھا!

•

انسان کتنا ہی نیک بننا چاہے لیکن سوسائٹی اسے نیک بننے نہیں دیتی وہ اس کا زندگی کے ہر گوشے اور ہر موڑ پر تعاقب کرتی ہے۔ جین کچھ سے کچھ ہو گیا، اس کی روح بدل گئی، اس کا دل پلٹ گیا، اس کا سینہ جو کبھی شیطان کا نشیمن تھا۔ مقدسوں کی نیکیوں کا آشیانہ اور فرشتوں کی پاکیوں کا خزینہ بن گیا، تاہم سوسائٹی نہ تو اسے معاف کر سکی، نہ اس کی راہ روکنے سے باز

کم لوگوں نے شاہزادہ "چم" کا نام سُنا ہوگا۔ عام طور پر مؤرخوں نے بھی اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہ نام بالکل اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ اس کا واقعہ ترکی تاریخ میں ایک نہایت ہی غمناک فاجعہ (ٹریجڈی) ہے۔ اور اس وقت بھی مشرقی دنیا کے لیے عبرت و موعظت کا ایک درس ہے۔ آج ہم آپ سے اس اہم شخصیت کا تعارف کراتے ہیں۔

چم — یا یورپین تلفظ کے مطابق "زیزم" — ایک بدنصیب مشرقی

اور دہشت انگیز خطرہ میں پڑ کر بچاتا ہے جس کا تصور بھی انسان کو سہما دے، وہ بھی اس کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا اور اس سے منہ موڑ لیتا ہے۔ آخر وہ وقت آتا ہے جب اسی برس کی عمر میں تن تنہا بستر موت پر کروٹیں بدلتا ہے۔ اس وقت انسان تیار ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ انصاف کرے۔

ساری عمر کی نیکی اور قربانی کے بعد، عتراف کی یہی چند گھڑیاں تھیں جو سوسائٹی اُسے دے سکی۔

گلیشیا کی حکومت سپرد کر دی ۔ اس وقت جم کی عمر صرف اٹھارہ سال کی تھی ، مگر وہ پختہ کار حکمراں بن چکا تھا ۔

گلیشیا میں اس نے اپنی انتظامی قابلیت کے بڑے بڑے ثبوت پیش کیے ۔ یہ صوبہ پہلے سلجوقیوں کی ایک ریاست تھا ۔ آل عثمان نے اسے فتح تو کر لیا تھا ۔ مگر پوری طرح قابو نہیں پا سکے تھے ۔ ہمیشہ بدامنی اور شورش برپا رہتی تھی ۔ سابق سلجوقی حکمران بغاوتوں پر بغاوتیں کرتے رہتے تھے مصر کے چرکس بادشاہ اور ایران کے شہنشاہ ان کی امداد کرتے تھے ۔ اس وقت ترکی سلطنت میں اس صوبے سے زیادہ مشکل حکومت کسی صوبے کی نہ تھی والیوں پہ والی آتے تھے اور ناکام لوٹ جاتے تھے ۔

لیکن جم نے آتے ہی اپنی بے نظیر ہمت و شجاعت سے کام لے کر تمام شورش پسند عناصر کا خاتمہ کر دیا ۔ ہولناک معرکوں میں بے خوف و خطر گھس جاتا تھا ۔ دست بدست لڑائیاں لڑتا تھا ۔ بڑے بڑے شہ زوروں سے نبرد آزما ہوتا اور ہمیشہ غالب رہتا ۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کا رعب دلوں پر چھا گیا ۔ جم کا نام دل دہلا دیتا تھا ۔ [illegible] ڈر سے اس کا

شاہزادہ ہے۔ مصائب و آلام نے اُس سے محبت کی۔ زمانے نے بیوفائی کی۔ حسرت و غم نے اُس کا پیچھا کیا۔

سلطان محمد، فاتح قسطنطنیہ کا یہ منجھلا لڑکا تھا۔ اُس میں جسمانی قوت، ذہانت، حسن، خوش مزاجی، رقیق احساس، شجاعت، جملہ اوصاف جمع ہو گئے تھے۔ پیدائشی شاعر تھا۔ ترکی شعر و ادب میں اب تک اس کے آثار موجود ہیں؛ اور اس کی ذہنی بلندی اور شاعرانہ تخیل کا بہترین ثبوت ہیں۔

اس کا آغاز نہایت امید افزا تھا۔ گمان ہوتا تھا کہ قدرت اس پر پوری طرح مہربان ہے۔ ابھی اس کی عمر دس برس ہی کی تھی کہ اولو العزم باپ، محمد فاتح، اس کی قابلیت کا معترف ہو گیا اور صوبہ قسطمونی کا حاکم مقرر کر دیا۔ یہاں شعراء و ادباء کی ایک بڑی جماعت موجود تھی۔ کم سن شاہزادے نے انہیں باریاب کیا۔ تعلقات بڑھائے، اور خدا داد قابلیت کے ساتھ شعر و ادب کا باقاعدہ مطالعہ کیا۔ تھوڑی ہی مدت میں اپنے استادوں سے بھی بازی لے گیا۔ اسی زمانے میں ایک فارسی قصے “خورشید جمشید” کا ترکی شعر میں ترجمہ کیا اور اپنے والد کے نام ہدیہ کیا۔ محمد فاتح بہت خوش ہوا۔ پہلے سے زیادہ مہربان ہو گیا اور صوبہ

سے اس کی سخت مخالف تھی۔ دین و امت کے لیے اُسے خطرناک سمجھتی تھی۔ اس جماعت کا سرگروہ، شیخ الاسلام تھا۔

جم کا حریف، بایزید تھا۔ یہ اس کا بڑا بھائی اور ترکی دستور حکومت کی رو سے اپنے باپ کا وارث تھا۔ سلطان محمد کی زندگی میں دونوں حریف دُور دُور رہے۔ لیکن اس کی وفات کے بعد تصادم ضروری تھا۔

جم، عقل مند، بہادر، اولوالعزم، مگر عیاشی کی وجہ سے غفلت کا شکار ہو گیا تھا۔ بایزید بے خوف، بزدل، پست ہمت، مگر سلطنت حاصل کرنے کے لیے بے قرار تھا۔ بایزید اپنے بھائی کی قابلیتوں سے واقف تھا، اس لیے بہت بیدار رہتا تھا۔

اپنے باپ کی وفات کے وقت دونوں بھائی پایۂ تخت، قسطنطنیہ سے دُور تھے۔ جم کلیشیا میں تھا اور بایزید آماسیا کا حاکم تھا۔ وزیر اعظم محمد نشانی پاشا چونکہ جم کا طرفدار تھا، اس لیے اس نے سلطان کی موت فوج سے مخفی رکھی۔ کیونکہ فوج تمام تر ترکی علماء کے زیر اثر تھی۔۔۔

نام نہیں لیتے تھے۔ "رستم دوراں" کے لقب سے یاد کرنے لگے تھے۔

پانچ برس تک نہایت بیدار مغزی سے حکومت کرتا رہا۔ ہر طرف امن وامان قائم ہو چکا تھا۔ کوئی پیچیدگی بھی نہیں رہی تھی۔ اب اس نے اپنے تئیں معطل پایا۔ اس تعطل نے اس کے مزاج میں تبدیلی پیدا کی۔ اور اسی تبدیلی سے اس کی بدنصیبی کا آغاز ہوا۔

حکومت کی ذمہ داریوں سے غافل ہو گیا۔ عیش وعشرت کی بساط بچھا دی۔ نفس پرستی کا دروازہ کھول دیا۔ اس کا محل بوالہوسوں کا مرکز اور عیش پرستوں کا کعبہ بن گیا۔

اب تک وہ پوری قوم کا محبوب تھا۔ کوئی نہ تھا جو اسے محمد فاتح کا سچا جانشین نہ خیال کرتا ہو۔ ملک بھر کی یہی رائے تھی کہ آئندہ سلطان وہی رہے گا۔ لیکن اس نئی تبدیلی نے اس کی شہرت ومقبولیت کو سخت نقصان پہنچایا۔ دو جماعتیں قائم ہو گئیں:۔ ایک اب بھی اس کی مؤید تھی۔ پورے یورپ کے مقابلے کی قوت اسی میں دیکھتی تھی۔ یہ جماعت وزیر اعظم محمد نشانی پاشا کی تھی۔ دوسری جماعت فسق وفجور کی وجہ

ہوا کی طرح اڑ کر بایزید کے پاس پہنچا۔ ولی عہد گویا پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔ فوراً روانہ ہوگیا اور نہایت سرعت سے پایۂ تخت میں داخل ہوا۔ لیکن قصر شاہی میں فوج نے داخل ہونے نہیں دیا۔ اور اپنا انعام طلب کیا۔ گویا اپنی وفاداری کی قیمت لینی چاہی۔ بایزید ڈرپوک تھا۔ فوراً خزانے کا منہ کھول دیا۔ اور سب کو خوش کر دیا۔ بعد میں یہی بخشش فوج کا مطالبہ اور قرضہ بن گئی اور سلطنت کے لیے بہت مضر ثابت ہوئی۔

بایزید تخت نشین ہوگیا اور اپنے بھائی جم پر قابو حاصل کرنے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ جم اب تک اس انقلاب سے بے خبر تھا۔ باپ کی وفات اس وقت معلوم ہوئی جب صدر اعظم قتل اور بایزید تخت نشین ہو چکا تھا!

سخت متحیر ہوا کہ کیا کرے؟ یہ ظاہر تھا کہ صدر اعظم کے بعد پایۂ تخت میں اس کے حامیوں کی کوئی جماعت باقی نہیں رہی ہے علماء اس کے سخت خلاف ہیں اور عام رائے انہی کے زیر اثر ہے۔ اب اسے اپنے سامنے دو ہی راہیں نظر آتی تھیں: نہ بھائی کی اطاعت،

اس نے پہلے ایک خفیہ قاصد جم کے پاس بھیجا کہ فوراً پایۂ تخت پہنچو اور سلطنت پر قابض ہو جاؤ۔ نیز وہ تدبیریں بھی لکھ دیں جن سے بایزید زیر کیا جا سکتا تھا۔ کئی دن بعد دوسرا قاصد بایزید کے پاس بھیجا، اور تخت نشینی کی دعوت دی۔

دونوں قاصد روانہ ہو گئے۔ مگر جم بدقسمت تھا۔ اس کا قاصد پہنچ نہ سکا۔ کوتاہیہ کا حاکم سنان باشا، بایزید کا طرفدار تھا۔ وہ حقیقت سے واقف ہو گیا اور قاصد کو گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔ دوسری مصیبت یہ پڑی کہ پایۂ تخت کی فوج کو سلطان کی وفات کا پتہ چل گیا۔ وہ شاہی محل میں گھس پڑی اور بایزید کے لڑکے کو بایزید کی آمد تک تخت پر بٹھا دیا۔ سلطان محمد فاتح نے اپنے دونوں لڑکوں کے بیٹے بطور ضمانت کے اپنے پاس رکھ چھوڑے تھے تاکہ وہ وفادار اور اطاعت شعار رہیں۔ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو گیا بلکہ فوج سازش سے بھی واقف ہو گئی اور وزیر اعظم کو قتل کر ڈالا۔

اب جم کی زندگی کے ہولناک تاریک دن شروع ہوتے ہیں۔ قاصد

بھی ایشیائی ساحل پر جنگی کارروائی کرنے کے لیے آ موجود ہوا۔

دونوں فوجیں بیک وقت بروسہ کے سامنے پہنچیں۔ شہر والوں نے اپنی بربادی کے خوف سے دونوں پر شہر کے دروازے بند کر دئے۔ باہر ہی باہر فیصلہ کر لینے پر مجبور کیا۔ میدانِ جنگ گرم ہوا اور پہلے ہی معرکہ میں بایزید کی فوج بھاگ نکلی۔ چم، مظفر و منصور شہر میں داخل ہوا اور اپنی سابق عیاشی پھر شروع کر دی۔ اب اسے کامل یقین تھا کہ پایۂ تخت کا مالک ہو جائے گا۔

لیکن یہ اس کی سخت غلطی تھی۔ بایزید نے ایک اور فوج گراں سنان پاشا کی سپہ سالاری میں بھیجی۔ مگنیسا سے ایک دوسری فوج اس کی کمک پر چل دی؛ اور دونوں نے مل کر چم پر حملہ کر دیا۔ عیش پسند شاہزادے کے سپہ سالار، نصوح نے دشمن کی قوت دیکھی تو "دزہ" انداد کی طرف پسپا ہو گیا۔ خود چم کو بھی بروسہ خالی کرنا پڑا۔ صرف سترہ دن کی حکومت اس کی قسمت میں لکھی تھی!

بایزید نے صرف اپنی جنگی قوت ہی پر بھروسہ نہیں کیا، بلکہ سازش کا جال بھی پھیلا دیا۔ بڑی بڑی رشوتیں دے کر چم کے بہت سے

یا جنگ۔ پہلی صورت کی طرف اس کا رجحان تھا، مگر دو باتوں سے ڈرتا تھا۔ ایک یہ کہ گلیشیا کی حکومت اس کے ہاتھ سے چھین لی جائے گی۔ دوسرے یہ کہ بایزید اسے قتل کرنے کی کوشش کرے گا۔ کیونکہ ترک سلاطین کا یہ عام دستور تھا کہ اپنے بھائیوں کو قتل کر ڈالا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ کتنے ہی مطیع و وفادار ہوں۔

مجبوراً اس نے جنگ کا عزم کیا۔ اسے اپنی کامیابی کی قوی امید تھی۔ گلیشیا کے باشندے جنگجو اور وفادار تھے۔ اس نے خیال کیا۔ بایزید بزدل اور پست ہمت ہے۔ ہرگز مقابلہ نہ کر سکے گا۔

چنانچہ وہ فوراً کمربستہ ہو گیا اور ایک جرار فوج لے کر بروسہ کی طرف بڑھا۔ بروسہ، قسطنطنیہ کی کنجی ہے۔ اسے یقین تھا، بایزید کی تیاری سے پہلے ہی وہ بروسہ پہ قابض ہو جائے گا۔ مگر بایزید بھی غافل نہ تھا۔ مقابلہ کی تیاری کر چکا تھا۔ جم کے متحرک ہوتے ہی اس نے بھی ایاز پاشا کی قیادت میں ایک فوج روانہ کر دی، اور خود

ن آق شہر میں اس طرح پہنچا کہ تن پر ایک کپڑا بھی نہ تھا اور سردی سے
س کا تمام بدن کانپ رہا تھا۔ اگر ایک شخص رحم کھا کے اسے اپنا
یم کوٹ نہ دے دیتا تو یقیناً ٹھٹھر کر مر جاتا!

شکست کے ایک ہفتہ بعد وہ قونیہ پہنچا۔ یہاں اپنی ماں اور
بیوی سے ملاقات ہوئی۔ انہیں لے کر شام روانہ ہوا، اور شام سے
۲۸ جون ۱۴۸۲ء کو مصر پہنچا۔ مصر میں اس کا بڑا شاندار استقبال کیا
گیا۔ خود سلطان قایتبائی نے شہر کے باہر آکر خیر مقدم کیا اور معزز مہمان
کو اپنے محل میں اتارا۔ چار مہینے آرام لینے کے بعد حج کے لیے مکہ
معظمہ روانہ ہوا۔ وہاں بہت سے ترک سرداروں سے ملاقات ہوئی
یہ لوگ بایزید کے خلاف تھے۔ انہوں نے شہزادے کو از سر نو
قسمت آزمائی کا مشورہ دیا اور اپنی عقیدت و خدمت پیش کی۔ انہی
ں قاسم بیگ حاکم گلیشیا بھی تھا۔

جم نے پھر کر ہمت چست کی۔ حلب پہنچا۔ وہاں بایزید کے کئی
سپہ سالار اس کے انتظار میں تھے۔ انہیں ساتھ لے کر گلیشیا گیا اور

آدمی ملا لیے۔ حتیٰ کہ اس کا وزیر یعقوب بھی خیانت پر آمادہ ہو گیا۔ یعقوب نے اپنے آقا کو ینی شہر چلنے کا مشورہ دیا۔ یہاں بایزید کی ایک بڑی فوج موجود تھی۔ فوراً جم پر ٹوٹ پڑی۔ اب بھی پلہ شاہزادے ہی کا بھاری تھا مگر عین میدان جنگ میں اس کے سپہ سالار نصوح نے دغا کیا اور فوج کا ایک بڑا حصہ لے کر دشمن سے جا ملا۔ اب جم کے لیے راہ فرار اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہا تھا۔

لیکن ابھی ایک امید باقی تھی۔ سلجوق خاتون، سلطان محمد فاتح کی پھوپھی، دونوں بھائیوں میں صلح کی کوشش کر رہی تھی۔ خود جم نے اسے بروسہ سے بھیجا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ سلطنت تقسیم ہو جائے۔ یورپین علاقوں پر بایزید حکومت کرے اور ایشیا جم کے حوالے کر دے۔ نیک دل سلجوق خاتون نے سلطان کو بہت کچھ سمجھایا۔ بھائی کے حقوق یاد دلائے۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ بایزید نے صاف کہہ دیا "بادشاہوں میں رشتہ نہیں ہوتا۔"

جم شکست کھا کر بھاگا۔ راستہ میں خود اسی کے سپاہیوں نے اسے لوٹ لیا اور سخت زخمی کیا۔ محمد فاتح کا اولوالعزم فرزند دوسرے

نے مشورہ دیا کہ یورپ جائے اور وہاں کے بادشاہوں کی مدد سے اپنا ملک فتح کرے۔

شاہزادے نے بڑے پس و پیش کے بعد یہ تجویز قبول کر لی۔ قسطنطنیہ کی فتح کا واقعہ ابھی تازہ ہی تھا۔ یورپ کے تمام بادشاہ ترکوں کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ قوی امید تھی کہ وہ سلطنت عثمانیہ کی تباہی کے خیال سے اس باہمی خانہ جنگی میں شرکت منظور کر لیں گے، اور اس طرح مداخلت و استیلاء کا موقعہ بہم پہنچائیں گے۔

جم نے جزیرۂ روڈس میں اپنا ایک دوست بھیجا۔ اس وقت یہ جزیرہ مشہور صلیبی مجاہدین "سینٹ جان کے سواروں" کے قبضہ میں تھا۔ جزیرے کے حاکم اعلیٰ نے اپنے ارکان حکومت کے مشورے سے شاہزادے کی حمایت قبول کر لی۔ آنے کی دعوت دی۔ اور اپنا جنگی بیڑہ اس کے لیے بھیج دیا۔

۲۳ جولائی ۱۴۸۲ء کو جم کا روڈس میں شاہانہ استقبال کیا گیا۔

وعدہ کیا کہ سلطان بننے کے بعد گلیشیا کو خود مختاری دے گا۔

جم نے ایک بڑی فوج جمع کر لی اور قونیہ کی طرف بڑھا۔ بایزید نے سنا تو ایک لشکر گراں کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس کی فوج کا سپہ سالار اپنے زمانے کا سب سے بڑا جنگی آدمی تھا۔ کدیک احمد پاشا فاتح اٹرنٹو مشرق و مغرب، دونوں دنیاؤں میں مشہور تھا۔ اس نے آتے ہی جم کی فوج تہہ بالا کر ڈالی۔

جم، پھر بھاگا اور گلیشیا کے پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو گیا۔ بایزید نے ایک وفد بھیج کر خواہش کی کہ جنگ سے باز آجائے اور پُر امن زندگی اختیار کرے۔ اس نے منظور کر لیا مگر اس شرط پر کہ اُسے چند صوبوں کی حکومت بخش دی جائے۔ بایزید نے انکار کیا: "ایک سلطنت میں دو ساجھی جمع نہیں ہو سکتے" اِس کا صاف جواب تھا۔

بایزید نے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ حریف کا پہاڑوں میں بھی شروع کر دیا۔ جم کے لیے اب وسیع دنیا تنگ ہو گئی اس۔ ارادہ کیا کہ مصر یا ایران میں جا کر پناہ ڈھونڈے۔ مگر تا

سے روانہ ہوا۔ اسے یقین تھا کہ فرانس جا رہا ہے۔ وہاں آزادانہ زندگی بسر کرے گا۔ مگر جہاز میں بیٹھتے ہی اس نے محسوس کیا کہ حکام جزیرہ کی حراست و قید میں ہے اور وہ اسے آزاد کرنا نہیں چاہتے مگر اب مجبور تھا۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

شاہزادہ، شہر نیس میں پہنچایا گیا۔ یہ مقام اسے بہت پسند آیا۔ اس کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا۔ یہیں اقامت اختیار کرنی چاہتا تھا مگر تخت شاہی کے لیے بے چین تھا۔ چنانچہ یہاں سے شاہ فرانس کے پاس قاصد بھیجا اور امداد کی درخواست کی۔ لیکن حکومت روڈس کے آدمیوں نے قاصد کو راستہ میں روک لیا اور شاہزادے کو فروری ۱۴۸۳ء میں نیس سے دوسری جگہ لے گئے۔ اب اسے کہیں جمنے نہیں دیتے تھے شہروں شہروں لیے پھرتے تھے اور سختی سے نگرانی کرتے تھے۔

جم کو یقین ہو گیا کہ اسے دھوکا دیا گیا ہے۔ یہ لوگ اس کے ذریعہ بایزید سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ چنانچہ اس نے پھر دو قاصد روانہ کیے۔ ایک فرانس کو، دوسرا ہنگری کو۔ مگر اس کے میزبان روڈس

اور نہایت عزت و احترام سے اس کی ضیافتیں شروع ہوئیں۔ بایزید کو معلوم ہوا تو اس نے جزیرہ کی حکومت کو دائمی صلح کے معاہدہ کا پیغام بھیجا۔ ساتھ ہی بہت سے امتیازات بھی پیش کیئے۔ ان مراعات کے صلے میں جم کی حوالگی کی درخواست کی۔ جزیرہ کی حکومت بہت خوش ہوئی۔ اس نے شاہانہ مراعات قبول کر لیں۔ مگر جم کے حوالہ کرنے سے اس بنا پر انکار کیا کہ وہ مہمان ہے۔ البتہ وعدہ کیا کہ اسے جزیرے سے نکال دیا جائے گا۔

جزیرے کی حکومت نے ایک طرف بایزید سے معاملہ طے کر لیا دوسری طرف جم سے وعدہ لے لیا کہ سلطنت پر قابض ہونے کے بعد اسے عظیم الشان مراعات دے گا۔ باضابطہ عہد نامہ لکھوا لینے کے بعد شاہزادے سے کہا کہ یہاں اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ بایزید نے اسے زہر دینے کے لیے اپنے جاسوس بھیج دئے ہیں۔ لہذا مصلحت یہی ہے کہ فرانس چلا جائے۔

بدنصیب شاہزادہ راضی ہوگیا۔ اور اگست ۱۴۸۲ء میں جزیرے

حوالہ کر دیا۔

جم، روم کو روانہ کیا گیا۔ پوپ سے ملاقات ہوئی۔ جم نے اپنی مُصیبتیں نہایت مؤثر پیرایہ میں بیان کیں۔ اور درخواست کی کہ اسے مصر جانے دیا جائے جہاں اس کی ماں اور بیوی مدتوں سے جدائی کا غم کھا رہی ہیں۔ مگر پوپ نے منظور نہیں کیا۔ اس نے کہا "یورپ کے بادشاہ، ترکی پر چڑھائی کرنے کی تیاری کر رہے ہیں تاکہ تمہیں تخت نشین کر دیں" ساتھ ہی اس نے بہت اصرار کیا کہ مسیحی دین اختیار کر لے تاکہ "دنیا کے ساتھ آخرت کی عزت بھی حاصل ہو جائے"

جم، پکا مسلمان تھا۔ پوپ کی یہ دعوت حقارت سے رد کر دی۔ اس نے سختی سے کہا "اگر تمام دنیا کی بادشاہی مل جائے، تو بھی میں اپنا دین فروخت نہیں کروں گا" اتنا ہی نہیں بلکہ غیور شاہزادے نے پوپ کے روبرو سر جھکانے یا اس کے ہاتھ کو بوسہ دینے سے بھی انکار کر دیا، جیسا کہ شاہان یورپ کا دستور تھا۔ اس نے کہا "میں مسلمان ہوں۔ پوپ کے سامنے نہ تو جھک سکتا ہوں، نہ اس کا ہاتھ چُوم سکتا

کے حاکموں کو خبر مل گئی اور اسے قلعہ ساساگ میں تن تنہا قید کر دیا گیا۔

اب جم کی زندگی میں پھر ایک نیا انقلاب ہوتا ہے۔ قلعہ ساساک کا مالک ایک ڈیوک تھا۔ اس کی لڑکی دلینیا ہیلانا حسن و جمال میں یکتا تھی۔ شاہزادے نے اسے دیکھا تو عاشق ہو گیا۔ دوشیزہ کو بھی اس سے محبت ہو گئی۔ محبت نے مردِ میدان جم کی طبیعت بالکل بدل ڈالی۔ جنگ و جدل سے نفرت ہو گئی۔ حکومت کا شوق زائل ہو گیا۔ خاموش زندگی کی طلب پیدا ہوئی۔ اس نے بایزید کو پے در پے خطوط بھیجے اور رحم و کرم کی درخواست کی۔ مگر سنگ دل بھائی کو رحم نہ آیا۔ دشمن کو جھکتے دیکھ کر اس کی ہمت اور بھی بڑھ گئی۔ اس نے شاہ فرانس سے مطالبہ کیا کہ جم کو فوراً اپنی حدود سے خارج کر دے۔

جزیرہ روڈس کے حکام نے دیکھا کہ شکار ہاتھ سے جاتا ہے۔ فوراً ایک نئے سودے پر آمادہ ہو گئے۔ پوپ انوسینٹ ہشتم نے ایک بہت بڑی قیمت لے کر، ۱۳ مارچ ۱۴۸۹ء کو شاہزادہ ان سے

اثر نہیں پڑتا تھا۔ لیکن اس مدت کے بعد آہستہ آہستہ اس کی تاثیر کام کرنے لگتی تھی، اور بتدریج مریض کا خاتمہ کر دیتی تھی۔ پوپ نے یہی زہر جم کو کھلا دیا، اور اس کی اطلاع بایزید کو دے کر اس سے مطلوبہ رقم حاصل کر لی۔ پھر زندہ و سالم جم، چارلس کے حوالہ کر دیا، اور اس سے بھی صلح کر لی!

جم، شاہ فرانس کے قبضہ میں آگیا۔ چارلس نے اسے ترکی پر فوج کشی کے لیے آمادہ کرنا شروع کیا۔ مگر اب وہ سمجھ چکا تھا کہ یورپ اس کی طرفداری نہیں کر رہا ہے۔ اس کی آڑ میں سب سے بڑی اسلامی سلطنت تباہ کرنی چاہتا ہے۔ چنانچہ اس نے قطعی طور پر انکار کر دیا۔ بادشاہ نے ناراض ہو کر قید کر دیا۔ مگر اب اس کی دائمی رہائی کا وقت بھی آ پہنچا تھا۔ پولس رسول کے جانشین پوپ کا زہر اس کے جسم میں سرایت کر چکا تھا وہ ابھی ناپولی ہی میں تھا کہ ۲ر فروری ۱۴۹۵ء میں انتہائی حسرت و یاس کے ساتھ اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔!

رہوں!"

پوپ نے اسے ویٹیکان میں نظر بند کر دیا اور دول یورپ کو ترکی پر حملہ کی ترغیب دینے لگا۔ مگر اس وقت بھی یورپ میں باہم دگر سخت منافست تھی۔ آپس میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اسی اثنا میں پوپ نے انتقال کیا اور مشہور ظالم کارڈینل، اسکندر اس کا جانشین ہوا۔ اس نے اس عظیم رقم پر قناعت نہیں کی جو جم کو قید میں رکھنے کے صلہ میں بایزید سے سالانہ وصول کیا کرتا تھا۔ بلکہ ایک بہت بڑی رشوت لے کر اس کے قتل پر آمادہ ہوگیا۔

اسی زمانہ میں دسمبر ۱۴۹۴ء میں چارلس ہشتم شاہ فرانس نے روم کا محاصرہ کر لیا، اور صلح کی ایک شرط یہ بھی قرار دی کہ جم اس کے حوالہ کر دیا جائے۔ پوپ نے دونوں طرف سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس زمانے میں یورپ کے روحانی رہنما آلات و وسائل قتل کے بھی سب سے بڑے ماہر تھے۔ پوپ کے پاس ایک ایسا زہر موجود تھا جو اگر ایک تندرست آدمی کو کھلا دیا جائے، تو ایک خاص مدت تک اس کی تندرستی پر کوئی

تصویر، شمع اور افشاں کی شہرت یافتہ مصنفہ
محترمہ "اے آر خاتون" کا نہایت دلچسپ ناول

چشمہ

دو بہنوں کی کہانی

جن میں ایک خوبصورت تھی اور دوسری بدصورت

بدصورت لڑکی کی شادی ایک حسین نوجوان سے ہوئی اور خوبصورت لڑکی ایک ادھیڑ عمر، کم رو لیکن نہایت ذہین اور دولتمند بیرسٹر کے حصہ میں آئی۔

یہ کوئی نئی بات نہیں۔ ہمارے ملک میں ایسا ہی ہوتا رہتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز تو وہ "چشمہ" ہے جس کی کہانی ان دونوں بہنوں کی زندگی سے وابستہ ہے۔

متانت اور مزاح کا حسین امتزاج۔ عجیب کہانی، انوکھا رومان، کاغذ گلیز۔ صفحات تقریباً ایک ہزار خوشنما گیٹ اپ قیمت دس روپیہ بارہ آنے۔

تصویر	شمع	افشاں
چار روپیہ آٹھ آنے	پانچ روپے	سات روپے آٹھ آنے

اِس کے آخری الفاظ یہ تھے :-

"خُدایا! اگر دشمنانِ دین مجھ سے مسلمانوں کے خلاف کام لینا چاہتے ہیں۔ تو مجھے جلد موت دے دے۔ اور ان کا مقصد پُورا نہ ہونے دے۔"

نسیم حجازی کا معرکتہ الآرا اسلامی تاریخی ناول

آخری چٹان

- بغداد کی تباہی ایک عبرت ناک داستان۔
- چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کی خونریزی اور ظلم و تشدد کی دردانگیز کہانی۔
- جب ایران ایشیائے کوچک اور عرب تاتاریوں نے تباہی مچا رکھی تھی۔
- جب کہ خوارزم کا بچہ بچہ ان کی خونیں تلواروں کی بھینٹ چڑھ گیا۔
- جب بغداد میں لوگ اپنی آزادی برقرار رکھنے کی بجائے شیعہ سنی کے جھگڑوں میں گرفتار تھے
- جب خاندان عباسیہ کے آخری خلیفہ نے شراب کے نشہ میں مدہوش ہوکر اپنی تمام عقل ایک غدار وزیر کے سپرد کر دی۔ اس وقت سرزمین بغداد سے ایک مرد مجاہد اٹھا۔ اس نے سوئے ہوئے شیروں کو جگانا چاہا۔

بغداد کی ایک نازک اندام دوشیزہ نے تلوار اٹھائی اور مسلمانوں کو ہوشیار کرنے کے جرم میں شہید کر دی گئی۔ نمک حراموں اور غداروں نے مسلمانوں کو باہمی جھگڑوں کا نشہ پلا کر اس طرح سلا دیا کہ وہ جھنجوڑنے کے باوجود نہ جاگے اور آخر بغداد تباہ ہو گیا۔ قیمت چھ روپے۔

مسٹر فیاض علی ایڈووکیٹ کے دو مشہور مقبول ناول

انور

دو بہت ہی خوبصورت اور طرحدار نوجوانوں کی داستان۔ جن میں ایک بہت ہی نیک اور دوسرا انتہائی مکار تھا۔ ایک حسین لڑکی ان دونوں کے درمیان وجہ نزع بن گئی۔ بیحد پراسرار اور سنسنی خیز داستان۔ ایک بازاری عورت کی سچی محبت اور قربانی اس کتاب کی مقبولیت اس بات سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کے اب تک پچاس ایڈیشن مختلف مقامات سے شائع ہو چکے ہیں، ضخیم ناول۔ بہترین کتابت وطباعت عمدہ کاغذ شاندار گیٹ اپ۔ قیمت صرف آٹھ روپے آٹھ آنے۔

شمیم

ایک ہندوستانی مرد اور امریکہ کی ایک بیحد دولتمند حسینہ کی کہانی عورت کی وفا۔ محبت اور ایثار کی بے نظیر داستان۔ لکھنوی تہذیب کی منظر کشی آنسوؤں اور قہقہوں کا حسین امتزاج۔ بہت ہی دلچسپ اور ضخیم ناول۔ شاندار گیٹ اپ۔ قیمت سات روپے آٹھ آنے۔

جناب نسیم حجازی کا معرکۃ الآرا اسلامی تاریخی ناول

داستان مجاہد

بارہ سو برس پیشتر کی ایک داستان۔ جب مسلمان بتیس دانتوں میں زبان کی طرح عیسائیوں اور بربریوں میں گھرے ہوئے تھے۔

جب مسلمان قرآن مجید کی اشاعت اور تبلیغ کی خاطر تلوار اٹھاتے تھے۔

جب مسلمان دشمنوں کی تعداد سے کبھی مرعوب نہ ہوتے تھے۔

جب مسلمان محبت، ایمان اور انصاف کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔

جب یورپ والے مسلمانوں کا خاتمہ کر دینے پر تل گئے تھے۔

داستان مجاہد۔ اس خونیں دور کا اسلامی تاریخی شاہکار ہے جس میں ایک مرد مجاہد کے سرفروشانہ کارناموں کو دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے جس کے پرپیچ واقعات پڑھ کر آپ حیران رہ جائیں گے۔ جس میں معصوم محبت کی سلگتی ہوئی چنگاریاں حسن و رعنائی کی رنگینیاں۔ تلواروں کی جھنکاریں اور زخمیوں کی آہیں۔ غرض سب کچھ آپ کو ملے گا۔

دیدہ زیب ایمان افروز سرورق۔ کتابت، طباعت دلپسند۔ قیمت چار روپے